عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوع اسلام

ایک اسلامی مجلہ

جنوری ۱۹۳۹

ایک روپیہ

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

آرام باغ روڈ کراچی

مرتب
محمد یونس

بدل اشتراک
سالانہ دس روپے
ششماہی چھ روپے

جلد ۲ جنوری سنہ ۴۹ ۱۹ء نمبر ۱

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
۱۲ ربیع الاول	۱	سنہ ۴۹ ۱۹ء	۳۴
بحضور سرور کونین	۲	منیجر کا خط	۴۰
ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ	۳	احباب سے معذرت (جناب پرویز)	۴۳
چائے کا دور (دوسرا رخ)	۴	مختصرات	۴۳
عزم و استقامت	۵	سلیم کے نام	۴۵
لمعات	۶	(محترم پرویز صاحب)	″
مظلومین کشمیر کی یاد میں		نقد و نظر	۴۶
(۱) تفریحات	″	باب المراسلات	۱۰۰ — [illegible]
(۲) پارٹیاں	″	(۱) ایصال ثواب	″
وادی کشمیر	۱۲	(۲) زکوٰۃ بل	″
(جناب اسد ملتانی)	″	(۳) اسلامی جماعت	″
نگہ بازگشت	۱۶	(۴) مجلس دستور ساز	″

۱۲ ربیع الاوّل

کے اس یوم مقدس کی یاد میں جب فاران کی چوٹیوں سے اُس آفتاب جہاں تاب کا طلوع ہوا جس کی رحمت وہدایت کی روشنی تمام کرۂ ارض کی تاریکیوں کے لئے پیامِ سحر تھی۔

وہ رازِ خلقتِ ہستی وہ معنیٔ کونین
وہ جانِ حسنِ ازل وہ بہارِ صبحِ وجود
وہ آفتابِ حرم، نازنینِ کنجِ حرا
وہ دل کا نور، وہ اربابِ درد کا مقصود
وہ سرورِ دوجہاں، وہ محمدِ عربی
بروحِ اعظم و پاکش درودِ لامحدود

اللّٰھم صل وسلم علیٰ نبیّنا محمّد خاتم المرسلین رحمۃ للعالمین شاھداً وّ مبشّراً ونذیراً۔ وداعیاً الی اللّٰہ باذنہٖ وسراجاً منیراً

آبروئے ما زنامِ مصطفےٰ است

بحضورِ سرورِ کونین علیہ التحیۃ والسلام

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

اے زمیں از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسہ بامت بلند

از تو بالا پایۂ ایں کائنات
فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات

گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

خشک گرداں بادہ در انگورِ من
زہر ریز اندر مئے کافورِ من

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام
با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل
عشقِ من گرداں ہم آغوشِ عمل

دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ
بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ

در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

(طلوعِ اسلام بزبانِ حضرتِ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ)

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ

۱) حکومت وہی کچھ کرے جو کچھ یہ کہے۔
۲) ہر کام اس کی منشا کے مطابق ہوا کرے۔
۳) اس کی ہر خواہش پوری ہو جایا کرے۔
۴) اس پر پابندی کوئی نہ ہو۔

اور ہر افسر یہ چاہتا ہے کہ

۱) یہ آمرِ مطلق ہو اور اس سے کوئی نہ پوچھے کہ اس نے ایسا فیصلہ کیوں دیا ہے!
۲) ہر شخص بلا چون و چرا اس کے ہر جائز و ناجائز حکم کی اطاعت کرے۔
۳) یہ جس کی جی چاہے عزت اتار دے۔ اور اس سے کبھی باز پرس نہ ہو۔
۴) یہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔

یہ اس لئے کہ

وہ سمجھتا ہے کہ حکومت صرف اس اکیلے کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے۔ اور

یہ سمجھتا ہے کہ اختیار اس لئے ہاتھ میں آیا ہے کہ اپنے جذبۂ حکومت کی تسکین کی جائے۔

اجتماعی زندگی کا تصور نہ اس کے سامنے ہے نہ اس کے۔

خدا نہ وہاں ہے نہ یہاں

ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من

چائے کا دَور

تصویر کا دوسرا رخ

طلوعِ اسلام ۔ ماہِ دسمبر کے پرچہ میں اس شخص کا حال لکھا تھا جس نے پانچ روپے دیکر قریباً پچاس روپے محصول کے بچائے ۔ اور آرام سے دوستوں میں خوش گپیاں اڑا رہا ہے ۔ اب اسکے مقابلے میں دوسرے شخص کا حال بھی سنیئں ۔

زید چار صد کا مال لیکر محصول کی چوکی پر آن کر محصول کروانا چاہتا ہے اور محصول ادا کرکے رسید حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ چونکہ منشی صاحب کو اس سے ذاتی آمدنی کی امید نہیں ۔ اس لئے وہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ مال اس قیمت سے زائد کا ہے جس کی بیجک زید دکھا رہا ہے ۔ اصلی قیمت لگانے کے بہانے سے وہ زید کو چپراسی کے ہمراہ صدر دفتر سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ہاں بھیجتا ہے ۔ وہاں سپرنٹنڈنٹ صاحب کسی ضروری کام کے بہانے سے باہر گئے ہوئے ہوتے ہیں ۔ صبح سے عصر تک زید کو وہاں بھوکا پیاسا رکنا پڑتا ہے ۔ عصر کے وقت سپرنٹنڈنٹ صاحب جو دراصل اپنے گھر ذاتی کاموں میں مشغول رہ کر تھکے ماندے واپس آتے ہیں تو عملے کا کوئی آدمی زید کو پیش کرتا ہے ۔ چونکہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو بھی اپنے ذاتی نقصان کا خیال ہوتا ہے کیونکہ منشی کی بالائی آمدنی میں ان کا بھی حصہ ہوتا ہے ۔ اس لئے وہ زید کو ہر طرح سے ناجائز طور پر ڈانٹتے ہیں ۔ کہ یہ مال اصل میں تقریباً ایک ہزار کی مالیت کا ہے ۔ اور تم نے دھوکا دینے کی غرض سے چار صد کی بیجک بنوائی ہے ۔ میں تمہیں دھوکہ دہی کے الزام میں پولیس کے حوالے کرتا ہوں ۔ آخر بڑی مشکل سے زید چار صد کی بجائے آٹھ صد کا محصول ادا کرکے صبح کا بھوکا پیاسا شام کو گھر پہنچتا ہے ۔ ڈر سے وہ کسی اعلیٰ افسر سے شکایت بھی نہیں کرسکتا کیونکہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں ۔

مال جس پہ دگنا محصول اور اتنی مصیبت اٹھائی بازار میں پہلے شخص کے مقابلے میں نہیں فروخت کرسکتا کیونکہ اس کے مال پر خرچ کم پڑا تھا ۔ ان حالات میں وہ بیچارا ایمانداری کی کیسے جرأت کرے گا ۔"

(قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب)

عزم و استقامت

جولائی سنہ ۱۹۴۴ء میں فرانس کی ایک یونیورسٹی کی عمارت پر خود اتحادیوں کا ایک بم گرا جس سے عمارت منہدم ہوگئی۔ بیسیوں طلبا اور پروفیسر مارے گئے اور خود وائس چانسلر زخمی ہوگیا۔ لیکن جتنے پروفیسر باقی رہ گئے انہوں نے شہر کے ایک مدرسہ میں یونیورسٹی کی جماعتیں کھول دیں۔ طالب علموں نے اپنے لئے ڈسک اور میزیں خود بنائیں۔ شکستہ دیواروں کے روزنوں کو چیتھڑوں سے بند کر دیا۔ ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی، کاغذ نہ تھا، ٹائپ رائٹر نہ تھا۔ لیکن کام بدستور جاری تھا۔ پروفیسروں نے اسی طرح لیکچر دیئے اور اسی طرح امتحان بھی ہوا۔ ایک پروفیسر نے کہا کہ "ہم نے اندازہ لگایا تھا کہ اگر ہم اس طرح دو یا تین سال تک کام کرتے رہے تو ہم یونیورسٹی کو بچا لیں گے۔

گذشتہ ہفتہ یونیورسٹی کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد نہایت تزک و احتشام سے رکھا گیا۔ اور جنرل آئزن ہاور کو اس بنا پر اعزازی ڈگری دی گئی، کہ اگر اس کے بم سے (جو وہاں نادانستہ آ لگا تھا) پرانی عمارت منہدم نہ ہوجاتی تو یہ نئی عمارت کس طرح بن سکتی تھی؟!" (نیویارک ٹائمز)

باز بخویشتن نگر!

"بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ آئین سازی کے سلسلہ میں ہمارے کام کی رفتار بہت سست رہی ہے جن لوگوں کا یہ خیال ہے وہ یقیناً ان اسباب و وجوہ سے باخبر ہوں گے جن کی بنا پر اس باب میں ہم خاطر خواہ ترقی نہیں کرسکے۔۔۔ جب ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی ہے تو توقع تھی کہ مجلسِ دستور ساز کے کتب خانہ سے ایک معقول تعداد میں کتابیں ہمیں مل جائیں گی۔ لیکن وہاں سے ہمیں ایک کتاب بھی نہ دی گئی۔ مجلسِ مقننہ سے ہمیں صرف ۲۹۸ کتابیں مل سکیں اور ان میں سے بھی ۹۹ کتابیں پرانے ایڈیشنوں کی تھیں اور باقیماندہ یا تو اسمبلی کی رپورٹیں تھیں یا حکومتِ ہند کی سرکاری کتابیں۔"

(خواجہ ناظم الدین صاحب، گورنر جنرل پاکستان، کی تقریر جس میں انہوں نے مجلس آئین ساز سے خطاب فرمایا تھا)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہم نے طلوعِ اسلام کی کسی سابقہ اشاعت میں بتایا تھا کہ ہندو کس طرح پاکستان کے خلاف منظم پروپیگنڈا کر رہا ہے۔ اس پروپیگنڈے میں سب سے بلند نعرہ یہ ہے کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت بننے والی ہے اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر اس میں کسی غیر مسلم کی خیر نہیں۔ نہ اس کی جان سلامت رہ سکیگی نہ مال۔ نہ مذہب محفوظ ہوگا نہ آبرو۔ گویا اسلامی نظام ایک ایسا ضابطہ ہوگا جس سے ازمنہ مظلمہ کی یاد تازہ ہو جائیگی اور ساری مملکت پاکستان میں وحشت و بربریت اور درندگی و سبعیت کا دور دورہ ہوگا۔ لہذا پاکستان کو ایک لادینی (Secular) اسٹیٹ رہنا چاہئے تاکہ اس میں اقلیتوں سے انسانیت کا سلوک روا رکھا جا سکے یہ ہے وہ پروپیگنڈا جو اسلامی نظام کے خلاف ہندوستان کے اندر اور اس کے باہر مسلسل و متواتر کیا جا رہا ہے اور جسے ہم سب سن رہے ہیں اور سن کر یوں ان سنی کر رہے ہیں گویا ہم سے اس کا کچھ تعلق ہی نہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان کا نظام اسلامی ہوگا یا لادینی۔ اگر اس کا نظام لادینی ہونا ہے تو ہمارے ارباب حل و عقد کو اس کے متعلق اعلان کر دینا چاہئے اور ہندوؤں سے کہدینا چاہئے کہ وہ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں، یہاں اسلامی نظام قائم نہیں کیا جائے گا۔ اس سے پاکستان ان مزعومہ اتہامات سے بچ جائیگا جو اسلامی نظام کے خدشات کے پیش نظر ہندوؤں کی طرف سے اس پر تو بر تو لگائے جا رہے ہیں۔

لیکن اگر ان کا فیصلہ ہے کہ پاکستان کا نظام اسلامی ہوگا تو پھر ان پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس باب میں اس نظام کی پوزیشن واضح کریں۔ اگر اسلامی نظام میں (پناہ بخدا) غیر مسلم اقلیتوں سے اسی قسم کا سلوک روا رکھا جائے گا جس کا پروپیگنڈا ہندوؤں کی طرف سے ہو رہا ہے تو حکومت پاکستان کا فرض ہے کہ وہ یہاں کی اقلیتوں کو صاف صاف بتا دے کہ تمہارے لئے یہاں مستقبل میں کیا ہے۔ تاکہ وہ اپنے متعلق فیصلہ کر سکیں۔ لیکن اگر اسلامی نظام میں اس قسم کے خدشات کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ محض پروپیگنڈا ہے تو اس کی وضاحت کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہندوؤں کی طرف سے اس قدر شدید پروپیگنڈا اور پاکستان کی طرف سے اس درجہ سنگین خاموشی، پاکستان کے لئے جو نقصان دہ ہے۔ اس سے مسلمان ہی بدنام نہیں ہو رہے خود اسلام بھی بدنام ہو رہا ہے، کہ اس خاموشی سے لوگ لامحالہ اس منطقی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہندوؤں کے یہ خدشات و تردودات حق بجانب ہیں۔ اسلامی نظام فی الواقعہ اسی قسم کی وحشت و درندگی کا مظہر ہوگا۔

کسی ضابطۂ حکومت میں یہ متعین کرنے کے لئے کہ اس میں انسانوں سے بہ حیثیت انسان کس قسم کا سلوک ہوگا۔ یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس ضابطہ میں "انسانیت کے بنیادی حقوق" (Fundamental Human Rights) کیا مقرر کئے گئے ہیں۔ یوں تو یورپ کے فلسفۂ سیاسیات میں یہ سوال ایک عرصے زیر بحث چلا آرہا تھا لیکن گذشتہ کچھ عرصہ سے دنیا کی سیاسی فضا میں ان حقوق کا بہت چرچا ہو رہا ہے۔ منشور اطلانٹک میں ان حقوق کا رخ متعین کیا گیا۔ پھر جمعیت اقوام متحدہ (U.N.O) نے اس موضوع کو خاص طور پر اپنے سامنے رکھا اور اس کی متعین کردہ کمیٹی نے حال ہی میں ان حقوق کا مسودہ مرتب کیا ہے۔ دنیا کی مختلف حکومتوں نے اپنے اپنے ضوابطِ آئین میں بھی ان حقوق کا (لفظاً یا عرفاً) تعین کیا ہے۔ خود ہندوستان کی مجلس آئین ساز نے ابھی پچھلے دنوں، اپنے مجوزہ آئین میں ان حقوق کی حدود واضح کی ہیں۔ گویا اب یہ مسئلہ ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ یہ دیکھنے کے لئے کہ کسی مملکت میں "غیروں" کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا جائے گا، یہ دیکھنا چاہیے کہ اس مملکت کا ضابطۂ آئین "انسانیت کے بنیادی حقوق" کیا متعین کرتا ہے۔ یعنی وہ حقوق جو اس مملکت کی حدود میں بسنے والے ہر انسان کو، بلا تفریق مذہب و ملت اور بلا امتیاز رنگ و نسل و وطن، حاصل ہوں گے۔ جن کا وہ بحیثیت انسان مطالبہ کر سکے گا۔ ظاہر ہے کہ کسی آئین میں جس قدر یہ حقوق واضح، وسیع، بلند اور محکم ہوں گے اسی قدر اس آئین کو وجہ شرفِ انسانیت اور باعث احترام آدمیت کیا جائے گا۔

ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ دنیا کو بتایا جائے کہ اسلامی نظام میں انسانیت کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔ اور یہ کہ چونکہ ہمارے عقیدہ کے مطابق کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ ان حقوق میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکے اس لئے پاکستان میں اسلامی نظام کی "تنفیذ" کی صورت میں یہ حقوق ہر انسان کو حاصل ہوں گے۔ قرآن میں یہ حقوق اصولی طور پر مذکور ہیں اور ہم انہیں یکجا کر کے بتا سکتے ہیں کہ ان کی نوعیت کیا ہے۔ لیکن ہماری یہ کوشش انفرادی ہوگی اور دنیا کی کسی حکومت کے لئے دلیل و حجت نہیں بن سکے گی۔ اس لئے یہ کام حکومت کی طرف سے ہونا چاہئے۔ اس کے لئے چاہئے کہ دنیا نے اس وقت تک جن حقوق کو انسانیت کے بنیادی حقوق قرار دیا ہے اور جو حقوق اس وقت تک مختلف ممالکِ عالم کے دساتیر مملکت میں موجود ہیں، انہیں واضح طور پر سامنے لایا جائے۔ نہیں! بلکہ اس سے بھی ایک قدم پیچھے جانے کی ضرورت ہے۔ یعنی اس وقت تک مغرب کے مفکرین اصولِ مملکت و سیاست نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اسے بھی سامنے رکھا جائے۔ اور اس جامع مجموعہ کے بعد یہ بتایا جائے کہ قرآن نے کون سے حقوقِ انسانیت متعین کئے ہیں۔ اور پھر اسے ساری دنیا کے سامنے پیش کر کے فیصلہ انہی پر چھوڑ دیا جائے کہ اس نظام کے تابع پاکستان کے غیر مسلم اقلیتوں کی کیا حالت ہوگی۔ اس باب میں ہمارا جتنا کچھ مطالعہ ہے اس کے پیش نظر ہم علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتے ہیں کہ جو حقوق انسانیت قرآن نے متعین کئے ہیں ان سے بہتر تو ایک طرف ان جیسے حقوق، نہ صرف یہ کہ اس وقت دنیا کے کسی

ضابطۂ آئین میں موجود نہیں بلکہ یہ بھی کہ مفکرین مغرب نے جن حقوق کو ایک مثالی مملکت (Ideal State) کے شایانِ شان قرار دیا ہے، قرآنی حقوق ان سے بھی بڑھ کر ہیں۔ ہم جو کچھ عرض کیا کرتے ہیں محض خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں کہا کرتے۔ ہمارے پاس بعونہ تعالیٰ، اپنے دعاوی کے لئے دلائل و براہین ہوتے ہیں۔ ہم اپنے اس دعوے کو بھی دلیل و حجت سے ثابت کر سکتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، انفرادی کوشش اس باب میں مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کا اعلان حکومت ہی کی طرف سے ہونا چاہئے تاکہ ساری دنیا اسے مستند منشور سمجھے اور اس پر دھیان دے۔ اگر حکومت پاکستان اس ضرورت کو محسوس کرتی ہے اور اس باب میں کسی کے تعاون کو بھی ضروری سمجھتی ہے۔ تو طلوعِ اسلام اس تعاون کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ یاد رکھئے۔ یہ نہ صرف مملکتِ پاکستان یا مسلمانانِ پاکستان کے لئے ہی مفید ہوگا بلکہ خود اسلام کی بھی ایک جلیل القدر خدمت ہوگی۔ حقوق انسانیت کا تعیین وقت کا ایک اہم تقاضا ہے اور مسلمانوں کی جو حکومت اس تقاضا کو پورا کرے گی وہ دنیا کے دل و دماغ سے، اسلام کے خلاف جذبات نفرت و عداوت دور کرنے میں ایک بہت بڑا قدم اٹھائے گی۔ اور اس سے نہ صرف اسلام کا نام بلند ہوگا بلکہ دنیائے انسانیت اسلام کے جن برکات و فیوض سے محروم رہ جانے سے جہنم کا ایندھن بن رہی ہے، ان سے بہرہ یاب ہو کر اطمینان و سکون کی جنت کی طرف جادہ پیما ہو سکے گی۔ غور فرمائیے کہ یہ خود انسانیت کی کتنی بڑی خدمت ہوگی! دیکھیں یہ شرف و تکریم کس کے مقدر میں لکھا ہے! کیا مملکتِ پاکستان، جو دنیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی مملکت ہے، اس شرف و مجد کے حصول کیلئے آگے نہیں بڑھے گی؟

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا — قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے مجلس مقننہ (پاکستان) کی ۱۶ دسمبر کی روئداد آئی۔ مسٹر تمیز الدین خاں کے صدر منتخب ہونے پر حزب مخالف کے لیڈر، مسٹر چٹو پادھیا نے انہیں مبارکباد دی۔ اس کے جواب میں خاں صاحب نے فرمایا۔

> ملک کی طرف سے پیہم تقاضے موصول ہو رہے ہیں کہ پاکستان کے آئین کو اسلامی خطوط پر تشکیل کیا جائے۔ اس تقاضا کو ہمیں ہر وقت پیش نظر رکھنا ہے۔ لیکن اس حقیقت کے دہرانے کی ضرورت نہیں کہ جو آئین آپ نے مرتب کرنا ہے اسے وسیع المشرب (Cosmopolitan) ہونا چاہئے جس میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ لہٰذا ہمارے سامنے جو کام ہے وہ مشکل ہے (ڈان ۱۸ دسمبر)

یہ بیان جس قدر تاسف انگیز ہے اسی قدر حیرت انگیز بھی ہے۔ اس کا تجزیہ کرنے سے تین اہم پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سب سے اول یہ کہ چونکہ ملک کی طرف سے تقاضے موصول ہو رہے ہیں کہ پاکستان کا نظام اسلامی ہونا چاہئے اس لئے ان تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ضروری ہے۔ یعنی پاکستان کے آئین کا اسلامی ہونا نہ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا آئین ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ اس لئے کہ حصول پاکستان

کی پوری جنگ اس بنا پر لڑی گئی تھی کہ اس سے مسلمانوں کو ایک ایسا خطۂ زمین مل جائے گا جس میں وہ اپنے تصورات کے مطابق حکومت قائم کر سکیں گے۔ بلکہ محض اس لئے کہ ملک سے اس کے تقاضے موصول ہو رہے ہیں جن سے مجبور ہو کر ہماری آئین ساز مجلس کو ایسا کرنا پڑے گا۔ ہم حیران ہیں کہ بالآخر اس قسم کی ذہنیت کو کیا کہا جائے! ہمیں حیرت ہے کہ ہمارے محترم اربابِ بست و کشاد کو ہو کیا گیا ہے؟ کیا اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا ان کے ایمان کا تقاضا نہیں؟ کیا ان کا مسلمان کہلانا اس دعوے کی دلیل نہیں کہ ان کا ضابطۂ حیات وہی ہونا چاہیے جس کی طرف نسبت رکھنے سے یہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں؟ تو کیا اس چیز کے لئے بھی انہیں اس کا انتظار تھا کہ ملک سے کس قسم کا تقاضا ہوتا ہے؟ اگر ملک خاموش رہتا، یا بفرضِ محال ان کا تقاضا اسلامی نظام کے سوا کچھ اور ہوتا تو مسلمانوں کی سب سے بڑی مملکت" کے یہ اربابِ حل و عقد یہاں کسی غیر اسلامی نظام کو رائج کرنے پر آمادہ ہو جاتے؟ پھر اگر یہ اضطراری نتیجہ ہے محض قوم کے تقاضوں کا، تو حصولِ پاکستان سے بہت پہلے سے لیکر آج تک، آپ حضرات میں سے ہی جو سربرآوردہ قائدین، قوم کے مختلف اجتماعات میں انہیں یقین دلایا کرتے تھے کہ پاکستان کا نظام اسلامی ہوگا، تو یہ ان کے دل کی آواز نہیں ہوتی تھی؟ سوچئے کہ آپ نے یہ کیا کہا ہے؟ محترم صدر صاحب کے یہ الفاظ فی الحقیقت ایک تاسف انگیز نفسیاتی کیفیت کا مظاہرہ ہیں۔ مسلمان کچھ اس طرح انگریز (اور اس کے بعد ہندو) سے مرعوب رہا ہے کہ اسے اپنے دعوئے اسلام کو بے دھڑک پیش کرنے میں ایک جھجک سی محسوس ہوتی رہی ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ جھجک، ہندوستان کی حدود تک تھی۔ لیکن یہاں کیفیت یہ ہے کہ اپنی آزاد سلطنت ہے۔ اس سلطنت کا آزاد دارالخلافہ ہے۔ اس دارالخلافہ میں آزاد مجلس آئین ساز ہے۔ اس مجلسِ آئین ساز کا آزاد صدر ہے۔ لیکن وہ جذبۂ مرعوبیت اسقدر غیر شعوری طور پر اعصاب پر مستولی ہے کہ یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا اور صاحب صدر، ہندو ارکانِ اسمبلی سے جھجکتے، سہمے، لرزتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ قوم ہمیں مجبور کر رہی ہے اس لئے ہمیں ان کے تقاضوں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ ہم اس قسم کی "فرقہ وارانہ تنگ نظری" کی ذہنیت نہیں رکھتے کہ پاکستان کے لئے مذہبی نظامِ حکومت کا خیال تک بھی دل میں لائیں! آپ دیکھتے ہیں کہ ہم اس باب میں کسقدر مجبور ہیں!!

اب محترم تمیز الدین خاں صاحب کی تقریر کی دوسری کڑی لیجئے۔ یہ کڑی درحقیقت دلیل ہے اس دعوے کی جو ہم نے اوپر پیش کیا ہے کہ یہ لوگ مذہبی نظامِ حکومت کو "تنگ نظر فرقہ وارانہ" ذہنیت کا مظاہرہ سمجھتے ہیں اس لئے اسے اپنی طرف منسوب کرنے سے شرماتے اور گھبراتے ہیں۔ محترم خاں صاحب نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کا اسلامی نظام کا تقاضا تو بیشک ہمارے سامنے رہے گا، لیکن آپ (ہندو ارکانِ اسمبلی) اس سے گھبرائیں نہیں۔ جو آئین یہاں وضع کیا جائے گا وہ وسیع المشرب

(Cosmopolitan.) ہوگا۔ یعنی یہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف ہے کہ اسلامی نظام وسیع المشرب نہیں ہوتا۔ اس نظام کو اس شکل میں ڈھالنا ہوگا کہ وہ وسیع المشرب ہو جائے تاکہ ایکطرف مسلمانوں کا تقاضا بھی پورا ہو جائے اور دوسری طرف اس نظام کی تنگ نگہی کشادگی میں بدل جائے تاکہ اس سے غیر مسلم اقلیتوں کے تحفظ کا سامان پیدا ہو جائے" (یہ اس تقریر کی تیسری کڑی ہے)۔ یعنی اسلامی نظام میں از خود غیر مسلم اقلیتوں کے تحفظ کا کوئی سامان نہیں۔ اس نظام کو اس طرح سے بدلنا ہوگا کہ اس میں اقلیتوں کے تحفظ کی پوری پوری ضمانت ہو جائے۔ یہ ہے وہ کام جسے بہت مشکل کہا گیا ہے۔

ہم حیران ہیں کہ محترم خاں صاحب سے کیا عرض کریں۔ سوائے اس کے کہ

تا مرد سخن نگفتہ باشد۔ عیب و ہنرش نہفتہ باشد

کیا اچھا ہوتا اگر وہ اس باب میں خاموشی سے کام لیتے اور اس طرح جاننے والوں کی نگاہوں میں اپنا بھرم بنا رہنے دیتے اور نہ جاننے والوں کی نظروں میں اسلام کی رسوائی کا موجب نہ بنتے۔ لیکن اس واقعہ کا دکھ اتنا ہی نہیں۔ اصل دکھ یہ ہے کہ محترم تمیز الدین خاں صاحب اس مجلس کے صدر ہیں جس سے ہمیں یہ توقعات وابستہ ہیں کہ وہ ہمارے لئے اسلامی آئین مرتب کرے گی۔

میری اس سادگی پہ رحم کھانا کہ تم سے آرزوئے دل بیاں کی

جب مسٹر چانو پادھیا نے اپنے شکوک کا اظہار کیا تھا تو اس کا جواب یہ تھا کہ

> پاکستان کے غیر مسلموں کو ہمارے متعلق کسی غلط فہمی میں رہنے کی ضرورت نہیں۔ نہ اس باب میں کہ ہمارا آئین کیا ہوگا اور نہ اس میں کہ اس آئین میں غیر مسلموں کو کیا حقوق و مراعات حاصل ہوں گے۔ اول الذکر صورت میں اس لئے کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمانوں کا نظام قرآنی خطوط کے علاوہ کسی اور نہج پر تشکل ہو ہی نہیں سکتا۔ اور ثانی الذکر صورت میں اس لئے کہ قرآن نے واضح طور پر متعین کر دیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھنا ضروری ہے۔ اگر حزب مخالف کے محترم لیڈر کو خود اس نظام کے مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں تو میں انہیں بتائے دیتا ہوں کہ اس نظام میں ہر غیر مسلم کی جان کی اسی طرح حفاظت کی جائے گی جس طرح ایک مسلمان کی۔ ان کی عزت و ناموس کا اسی طرح احترام کیا جائے گا جس طرح ہم اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت و آبرو کا احترام کریں گے۔ ان کے اموال و املاک اسی طرح محفوظ رہیں گے جس طرح مسلمانوں کے۔ انہیں اپنے شخصی قانون (بیاہ، شادی، رسم و رواج، وراثت وغیرہ) میں پوری پوری آزادی ہوگی۔ ان کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ حتیٰ کہ ان کی پرستش گاہوں تک کی حفاظت ہم اپنے خون سے کریں گے۔ غیر مسلموں کی حفاظت کے لئے مسلمان سپاہی میدان جنگ میں اپنے

سینوں پر گولیاں کھائینگے۔ غرضیکہ ان کی ہر محبوب متاع کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی اور ان کا ان پر کوئی احسان نہیں رکھا جائیگا کیونکہ یہ ہمارے خدا کی طرف سے ہم پر عائد کردہ فریضہ ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو اپنے خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ یہ ہیں وہ تحفظات جو اسلامی ضابطۂ قانون نے ان کے لئے متعین کر رکھے ہیں اور جن میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کے ہم مجاز نہیں ہیں۔

مجھے امید ہے کہ حزبِ مخالف ان تحفظات سے مطمئن ہوگا۔ اور اگر اس پر بھی ان کا اطمینان نہیں تو ہم یوں بھی تیار ہیں کہ جو حقوق و مراعات ہندوستان میں مسلمانوں کو دیئے جائیں وہی ہم پاکستان میں ہندوؤں کو دے دینگے۔ فرمایئے! کونسی صورت آپ کو پسند ہے؟

اور اس پر بھی وہ نہ سمجھے تو اس بت سے خدا سمجھے

یہ تھا وہ جواب جو مسلمانوں کے نمائندہ کی طرف سے ان غیر مسلموں کو ملنا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ جواب کون دیتا!

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے　　مسکین دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں (اقبال)

"پنجاب کے Farce سیاسی ڈرامے کا آج ایک اور ایکٹ ختم ہوا۔ خان افتخار حسین خاں ممدوٹ وزیرِ اعظم نے بیالیس ارکان اسمبلی کی اس تحریری درخواست کو کہ وہ مستعفی ہو جائیں زیرِ بحث لانے سے انکار کر دیا۔ جب آپ کو بولنے پر مجبور کیا گیا تو آپ نے یہ کہہ کر کہ وہ مستعفی نہیں ہوں گے اجلاس کو برخواست کر دیا اور خود جلسہ گاہ سے چلے گئے ...... میاں ممتاز دولتانہ نے پورے شد و مد سے مغربی پنجاب کے موجودہ زعمائے حکومت کے خلاف مہم شروع کر رکھی ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ صوبے کی عظیم اکثریت ان کی مؤید ہے۔ نواب ممدوٹ بضد ہیں کہ وہ عنانِ حکومت سے دستکش نہیں ہوں گے اور مخالفین کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوں گے۔"

(سٹیٹسمین ۲۷ ۱۲/۴۸)

"ارکان اسمبلی کی اکثریت نے وزیرِ اعظم کے خلاف جو قرارداد عدم اعتماد پیش کی، نواب ممدوٹ نے اس پر بحث و تمحیص کے لئے اجلاس منعقد کرنے سے انکار کر دیا، حالانکہ حزبی ضوابط کی شق ۲۰ کے مطابق ایسی قرارداد کے نوٹس کی تاریخ سے آٹھویں دن کوایسا اجلاس منعقد ہو جانا چاہیئے ... بیالیس ارکان اسمبلی جو اجلاس میں حاضر تھے، یہ قوی رائے رکھتے ہیں کہ خان ممدوٹ نے ان کا اور صوبہ کا اعتماد کھو دیا ہے۔"　(ڈان ۲۷ ۱۲/۴۸)

* "الممتاز" (صدر مسلم لیگ کا دولتکدہ) اور "ممدوٹ ولا" (وزیرِ اعظم کا دولتکدہ) سوچ بچار

کو سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے . . . فریقین نے حریف کے اوسان خطا کرنے اور ہمنشینوں کو اپنے ساتھ ملانے کیلئے شدید اعصابی جنگ شروع کر رکھی ہے (پاکستان ٹائمز ۲۸ دسمبر ۴۸ء)

یہ ہے ہلکا سا پرتو اس سرتاسر فساد کا جو مغربی پنجاب کی جسدِ سیاست میں واقع ہو چکا ہے۔ مغربی پنجاب کے حریصانِ وزارت نے ملک و ملت کو گویا بازی بنا رکھا ہے۔ ہر ایک کا مطمحِ نگاہ اور قبلۂ مقصود وزارت ہے۔ دولتانہ وزارت سے الگ ہوتے ہیں تو مسلم لیگ کی صدارت پر قبضہ کر لیتے ہیں تاکہ جماعتی دباؤ سے مطلب براری کریں اور وزارت پر متمکن ہوں۔ ممدوٹ کوشش کرتے ہیں کہ صوبائی مسلم لیگ کی صدارت ان کے نامزد کے حصہ میں آئے تاکہ جماعت اور وزارت کی قیادت ان کا خصوصی اجارہ بن جائے۔ ارکانِ اسمبلی یعنی نمائندگانِ قوم اور محافظینِ حقوقِ ملت، اس انتظار میں ہیں کہ دیکھیں کس کا پلڑا بھاری ہوتا ہے تاکہ اس سے وفاداری کا اعلان کر کے اس خوانِ کرم کی خوشہ چینی کے مستحق بن جائیں۔ وہ ان دونوں زبردست اور حریف مقناطیسوں میں گھرے ہوئے ہیں، کبھی ادھر کھنچتے ہیں، کبھی ادھر۔ قوم دوست دیکر بے بس ہوگئی ہے اس کا سارے کا سارا نظام "جعفران ایں زماں" کے ہاتھوں فاسد ہو چکا ہے۔ اس کی روح قبض ہو رہی ہے اور اجارہ دارانِ ملت کے دماغوں میں وزارت کے خناس ناچ رہے ہیں۔ پاکستان پر گوناگوں خطرات و مہالک اپنے بوم صفت سائے ڈال رہے ہیں اور "زندہ دلانِ پنجاب" چشم بددور اپنے عشرت کدوں میں بیٹھ کر وقت گذری کی تفریح میں مصروف ہیں۔ روم جل رہا ہے اور نیرو بانسری بجا رہے ہیں۔

از نفاقش وحدتِ قومے دو نیم
ملتِ ما از وجودِ او لئیم!

مغربی پنجاب کا مرض اتنا مزمن اور لاعلاج ہو چکا ہے کہ یہ توقع بالکل عبث ہے کہ زید کی بجائے بکر آ جائے تو حالات سدھر جائیں گے اور سرحد سے اٹھارہ میل کے فاصلہ پر رہنے والے دفاعِ پاکستان کی حفاظت اپنی نازک ذمہ داریوں کو بطریقِ احسن محسوس کرنا شروع کر دیں گے۔ قائداعظم مرحوم نے بہت پہلے ممدوٹ کو وزارت کا نااہل قرار دیدیا تھا۔ قائداعظم کی بیزاری کے بعد موجودہ گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان نے بھی اس AUGEAN STABLE کو صاف کرنے کی کوشش کر دیکھی ہے۔ خان ممدوٹ مرکز سے ہدایات لیکر لاہور پہنچے۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ فارسی محاورہ کی "آمد او رفت" اور بس۔ بالآخر موجودہ گورنر جنرل کو بھی اس تماشے کے خلاف لب کشائی کرنا پڑی۔ اب آزمودہ کو آزمانا خردمندی نہیں۔ مغربی پنجاب پاکستان کے جسدِ سیاست پر رستا ہوا ناسور ہے۔ اس کا علاج ملاطفت کا مرہم نہیں، جراح کا نشتر ہے۔ اگر پنجاب میں صحیح وزارت بننے کے امکانات ہوتے تو جب قائداعظم مرحوم نے ممدوٹ کو نااہل قرار دیا تھا تو وہ ضرور زمامِ وزارت کسی اہل کے سپرد کر دیتے۔ اس سے ظاہر ہے اور تجربہ اس پر شاہد کہ یہاں یہ صورت کارگر ہو ہی نہیں سکتی — مغربی پنجاب کی وزارت ہی نہیں بلکہ مغربی پنجاب کی اسمبلی بھی اپنے فرائضِ منصبی کی بجا آوری اور عوام کی

نمائندگی سے مجرمانہ حد تک قاصر رہی ہے۔ بلکہ وزارت اور اسمبلی کی نشستیں ہی اس فسادِ عظیم کا باعث ہیں۔ پاکستان اس عیاشی اور اسراف کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ہم مرکز کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ جنگ زرگری کے ان وسیلوں کو مغربی پنجاب میں ختم کر دے۔ مغربی پنجاب کے عوام پر احسانِ عظیم ہوگا اگر فساد کے سرچشموں اور سازشوں کی آماجگاہوں یعنی وزارت اور اسمبلی دونوں کو توڑ دیا جائے اور صوبائی نظم و نسق گورنر کو سونپ دیا جائے۔ یہ نام نہاد جمہوری ادارے سینۂ ملت پر تقابوس کی طرح مسلط ہیں۔ دبے، پسے، راندے ہوئے عوام دہائی دیتے ہیں۔ ان کی مدد کو پہنچئے۔ ان کو بچائیے۔ پاکستان کو بچائیے۔ قبل اس کے کہ یہ لاش متعفن ہو جائے اس سے نجات حاصل کیجئے۔

مظلومین کشمیر کی یاد میں

(۱) تفریحات

ہفتہ پاپوش زیر اہتمام خواتین مسلم لیگ کراچی

۶ تا ۱۲ دسمبر

۸ دسمبر۔ صبح سینما شو۔

۱۰ دسمبر۔ پاکستان یونین جیک کلب میں گیارہ بجے صبح مینا بازار۔ زیر سرپرستی بیگم لیاقت علی خاں۔

۱۱ دسمبر۔ ۹ بجے شام انجمن ہال میں محفل قوالی اور دوسری "تفریحات"

۱۲ دسمبر۔ ۸ بجے شام انجمن ہال میں مشاعرہ۔

۱۱ دسمبر۔ جہانگیر کوارٹرز میں انجمن ملازمین پاکستان کی طرف سے مشاعرہ اور قوالی۔

۱۱ دسمبر۔ اسلامیہ کالج لاہور میں مشاعرہ۔

۱۱ دسمبر۔ بزم غزل کی طرف سے حیدرآباد (سندھ) میں مشاعرہ۔

۱۲ دسمبر۔ آل پاکستان اردو مرکز کی طرف سے ماڈل ہائی سکول ہال میں مشاعرہ۔

۱۴ دسمبر۔ یونیورسٹی ہال لاہور میں وزیر تعلیم کی صدارت میں مشاعرہ۔

---

۸ دسمبر۔ حیدرآباد (سندھ) میں مینا بازار۔

۸ دسمبر۔ پی اے ایس[1] کالج لاہور میں مشاعرہ۔

---

[1] سابقہ آئی سی ایس کا نام پاکستان میں پی اے ایس ہو گیا ہے۔ یہ کالج حال ہی میں بدیں غرض قائم ہوا ہے کہ آئی سی ایس کے امیدواروں کو اس میں تربیت دی جائے۔ ان ہونے والے افسرانِ حکومت کی دلچسپیاں ملاحظہ کیجئے۔

۱۵ دسمبر۔ پشاور ریڈیو سے مشاعرہ۔

۱۸ دسمبر۔ سندھ مسلم کالج کے شعبۂ سائنس کی طالبات کی طرف سے متفرق تفریحات۔
(طالبات؟ اور وہ بھی طالبات سائنس سے اور تفریحی مشاغل!)

۱۸ دسمبر۔ خواتین بزمِ عمل کی طرف سے خالقدینا ہال میں نظم خوانی اور گانا۔

۱۹ دسمبر۔ پاکستان انٹروڈکشن لیگ کی طرف سے محفلِ رقص و سرود۔

۱۹ دسمبر۔ خالقدینا ہال میں بزمِ موسیقی۔
اعلان ملاحظہ فرمائیے۔
میوزیکل کانفرنس (مجلس رقص و سرود) بمقام خالقدینا ہال ۱۹ دسمبر بروز اتوار ۶ بجے سے ۹ بجے تک منعقد ہوگی جس میں کراچی کی تقریباً تمام طوائفیں اپنے کمالات موسیقی و رقص کا مظاہرہ کریں گی۔ اس کی آمدنی کشمیر فنڈ میں جائے گی۔

۲۳ دسمبر۔ طلبائے میڈیکل کالج (کراچی) کی طرف سے تفریحات۔ مس انور سلطانہ رقص کریں گی۔

۲۵ دسمبر۔ شہداد پور (سندھ) میں مشاعرہ۔

۲۶ دسمبر۔ بزمِ پاکستان کی طرف سے حیدرآباد (سندھ) میں مشاعرہ۔

۲۷ دسمبر۔ خالقدینا ہال میں مشاعرہ۔

یکم جنوری ۱۹۵۱ء ملتان میں آل پاکستان مشاعرہ۔
اورینٹ ایرویز نے لاہور سے کراچی تک چار شاعروں کو مفت واپسی ٹکٹ پیش کئے ہیں۔

۱۵ جنوری۔ سرگودھا (مغربی پنجاب) میں آل پاکستان مشاعرہ۔ اعلان میں بتایا گیا ہے "مشاعرہ کی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں کئی نامور شاعرات بھی شمولیت کریں گی۔"

اواخر جنوری۔ انجمن معاونین اردو کی طرف سے خالقدینا ہال میں آل پاکستان مشاعرہ (نصف آمدنی کشمیر فنڈ میں)

یہ پانچویں عظیم ترین اسلامی اور نوزائیدہ سلطنت پاکستان کے ایک ماہ کی تفریحات کا سرسری جائزہ ہے۔ دیکھئے۔ مجاہدین کشمیر کے خون کا ایک ایک قطرہ کس طرح پاکستان میں شعر و نغمہ میں تبدیل ہو رہا ہے!

۲۔ پارٹیاں

۲ دسمبر۔ راجہ محمود آباد کو ڈنر جس میں ایک سو مہمانوں نے شرکت کی۔

۳ دسمبر۔ مسٹر اور بیگم لیاقت علی خاں کا ایٹ ہوم۔ تین سو مہمان شریک ہوئے۔

۴ دسمبر۔ مغربی پنجاب مسلم لیگ کے صدر میاں ممتاز دولتانہ اور سکرٹری مسٹر ولایت علی خاں کے اعزاز میں لورینگ (لاہور) میں ٹی پارٹی۔

۶ دسمبر۔ سید احمد اشرف کی طرف سے بیچ لگژری ہوٹل میں راجہ محمود آباد کو لنچ۔

۷ر دسمبر۔ چودھری اور بیگم خلیق الزماں کی طرف سے بیچ لگژری ہوٹل میں ٹی پارٹی۔ ۱۷۵ مہمان شریک ہوئے۔

۸ر دسمبر۔ دادو (سندھ) کے شہریوں کی طرف سے مسٹر دین محمد گورنر کو شاندار ایٹ ہوم۔ پانچ سو شہری شریک ہوئے۔

۱۳ر دسمبر۔ افسرانِ لاہور کی طرف سے ملاشور بازار کو گارڈن پارٹی۔ چار سو مہمانوں نے شرکت کی۔

۱۵ر دسمبر۔ سردار عبدالرب نشتر کی طرف سے ملاشور بازار کو ڈنر۔

۱۶ر دسمبر۔ ملاشور بازار کو کاٹھیاواڑی مسلمانوں کی طرف سے ٹی پارٹی۔

۱۷ر دسمبر۔ کراچی سٹی مسلم لیگ کی طرف سے ملاشور بازار کو ٹی پارٹی۔

۱۸ر دسمبر۔ پاکستان مسلم لیگ کے رکن خواجہ عبدالقیوم کی طرف سے مسٹر کھوڑو کو پارٹی۔ فریئر ہال میں۔

۱۹ر دسمبر۔ لیاقت علی خان صاحب کی طرف سے ملاشور بازار کو ڈنر۔

۱۹ر دسمبر۔ صدر سٹی مسلم لیگ کراچی کی طرف سے مدیرانِ پاکستان کو لنچ۔

۲۰ر دسمبر۔ گورنر جنرل کی طرف سے مدیرانِ پاکستان کو ڈنر۔

۲۱ر دسمبر۔ سندھ مرکزی مہاجرین کمیٹی کی طرف سے ملاشور بازار کو ٹی پارٹی۔

۲۲ر دسمبر۔ خواجہ شہاب الدین صاحب کی طرف سے نورالدین صاحب کو ٹی پارٹی۔ دو سو سے زیادہ مہمانوں کی شرکت۔

۲۳ر دسمبر۔ احمد بشیر خاں کی طرف سے بیچ لگژری ہوٹل میں یوسف ہارون کو ٹی پارٹی۔

۲۴ر دسمبر۔ کراچی میں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے دفتر کے افتتاح کے موقع پر چودھری غلام عباس اور سردار ابراہیم کو ٹی پارٹی۔

۲۴ر دسمبر۔ یوسف ہارون صاحب کی طرف سے اپنے دولتکدہ پر غلام محمد صاحب وزیر خزانہ کو ٹی پارٹی۔

۲۴ر دسمبر۔ میمن انجمن حیدرآباد (سندھ) کی طرف سے ملاشور بازار کو ٹی پارٹی۔

۲۶ر دسمبر۔ بنگالی کلب کی طرف سے مجلس دستور ساز کے بنگالی ارکان کو ایٹ ہوم۔

روحِ اکبری کا تیرو تو یونہی بدنام ہو گیا، ورنہ تاریخ اپنے آپ کو ہمیشہ دہراتی رہتی ہے۔

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

پس تحریر:۔

دوران مشاعرہ میں شریک ہونے والے شعراء میں سے بعض کو گورنر جنرل صاحب نے چائے پر مدعو کیا۔ شاعروں کا اجتماع ہو اور مشاعرہ نہ ہو۔ وہیں مشاعرہ شروع ہو گیا جسے بقول روزنامہ دوران نمازِ مغرب کی اذان نے ختم کیا۔

وادیٔ کشمیر

تو ہے کرۂ ارض پہ فردوس کی تصویر　　کفار تجھے کر نہیں سکتے کبھی تسخیر
اسلام سے وابستہ رہیگی تری تقدیر
اے وادیٔ کشمیر

کیا کم ہے کہ اس بات سے اپنا تجھے بنائیں　　کفار سیہ قلب و سیہ کار یہاں آئیں
آئے تھے جہاں نورجہاں اور جہانگیر
اے وادیٔ کشمیر

باہر سے ہیں اشرار تو اندر سے ہیں غدار　　ہر بات میں غدار ہیں غیروں کے طرفدار
سانپوں کو جو پالا ہے یہی ہے تری تقصیر
اے وادیٔ کشمیر

گلزار و خیاباں میں چلی ظلم کی تلوار　　رنگیں ہوئے خونِ شہدا سے ترے کہسار
کیا اب بھی نہ آئی تری فریاد میں تاثیر
اے وادیٔ کشمیر

اٹھا تری آنکھوں سے حجاب پردۂ غفلت　　ٹلنے کو ہے صد سالہ غلامی کی مصیبت
جاگی ہے مجاہد کی اذاں سے تری تقدیر
اے وادیٔ کشمیر

تیری یہ مصیبت ہے بھلا کس کو گوارا　　تیرے لئے جانباز مجاہد ہیں صف آرا
گونجا ترے کہسار میں پھر نعرۂ تکبیر
اے وادیٔ کشمیر

جس نے ترے بچوں پہ گرائے ہیں منوں بم　　جس نے تری جنت کو بنایا ہے جہنم
فی النار کرے گی اسے اسلام کی شمشیر
اے وادیٔ کشمیر

جس فوج پہ نازاں ہیں بہت ہند کے نازی　　اس فوج سے لے جائیں گے بازی ترے غازی
باطل کی وہ چلنے ہی نہ دینگے کوئی تدبیر
اے وادیٔ کشمیر

اسعد ملتانی

نگاہِ بازگشت

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

اس اشاعت سے طلوعِ اسلام کی پاکستانی زندگانی کا دوسرا سال شروع ہوتا ہے۔ یوں تو طلوعِ اسلام زمانہ قبل از قیامِ پاکستان میں بھی ذہنی طور پر پاکستان ہی میں تھا لیکن اُس وقت اس کی حیثیت "عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ" کی تھی اور اس کی نغمہ سنجی گرمیٔ نشاطِ تصور سے تھی۔ طلوعِ اسلام کو پاکستان سے جو خوش کن توقعات تھیں۔ اور جو رَبِّ لا یُخلِفُ المیعاد پر محکم ایمان کے طفیل اب بھی ہیں، قیامِ پاکستان کے بعد بہت سے حوادث ان کے خلاف معرضِ وقوع میں آ گئے۔ قیامِ پاکستان سے ملی مسائل کی نوعیت یوں بھی بدل جاتی لیکن ان حوادث نے اس تبدیلیٔ نوعیت میں اور گوناگوں اضافے کر دیئے۔ ملت کے خواب کی تعبیر ہوئی۔ پاکستان نے کرۂ ارض پر ایک ملک کی شکل اختیار کر کے اقوامِ ملل عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ملتِ اسلامیہ جس اندازِ سیاست کی عادی ہو چکی تھی، اس سے وہ اس انقلابِ عظیم کی متحمل نہ ہو سکی وہ اس کے تقاضوں کو پوری نہ اتر سکی، یہاں تک کہ اس کی حیران کن فتح شکست میں بدلی ہوئی نظر آنے لگی۔ مشرقی پنجاب، دہلی، مغربی یو۔پی، اور آس پاس کی ہندوستانی ریاستوں میں جس برق رفتاری، بے دردی، قساوتِ قلبی اور منظم سازش کے ماتحت مسلمانوں کا قتلِ عام برپا ہوا اس نے ملت کے اوسان خطا کر دیئے "تباہی و بربادی، مفلسی اور محتاجی، بے کسی اور بیچارگی، ذلت و رسوائی! کیا یہی وہ پاکستان ہے جس کے لئے دس برس تک ہم نے قربانیاں کیں؟" سابق کثیر پاکستانیوں تک کو یہ کچھ کہتے سنا گیا۔ نوزائیدہ مملکتِ پاکستان کے لئے گیارہ لاکھ مسلمانوں کا قتل رخون اور ستر لاکھ تباہ حال و فلاکت زدہ، مہاجر برہنہ مسلمانوں کی حدودِ مملکت میں از سرِ نو آبادکاری اور بحالی ایسی ہمت شکن اقتصادی، انتظامی اور سیاسی افتاد تھی کہ اس سے جانبر ہونا بظاہر ممکنات میں سے نہ تھا۔ پاکستان کے لئے یہی ابتلا کم نہ تھا کہ ہندوستان نے پاکستان کے جنگی ساز و سامان، نیز کروڑوں روپے کی رقم خطیر کو روک کر پاکستان کی بنیادوں کو مزید متزلزل اور دامن گیر ہزار گونہ مشکلات میں چند در چند اضافہ کر دیا تھا۔ اس غیر معمولی دورِ ابتلا میں طلوعِ اسلام نے ساڑھے پانچ سال کی خاموشی کے بعد پھر لب کشائی کی۔

اس صبر آزما، ہوش ربا اور طاقت شکن دور میں طلوعِ اسلام کن مقاصد و عزائم کو سامنے رکھ کر منظرِ شہود پر جلوہ گر

ہوا، ان کا خاکہ "پس چہ باید کرد" کے زیرِ عنوان پہلی اشاعت میں یوں پیش کیا گیا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ

(۱) بھک سے اُڑ جانے والے جذبات سے الگ ہو کر ٹھنڈے دل سے تمام حالات کا جائزہ لیا جائے اور مختلف اسباب و علل کا صحیح صحیح تجزیہ کیا جائے۔ جو جو غلطیاں ہم سے ہوئی ہیں ان کا کشادہ ظرفی سے اعتراف کیا جائے اور اس طرح انہیں آیندہ اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔

(۲) اس خطۂ ارض [illegible] کے تحفظ و استحکام کا پورا پورا سامان کیا جائے جسے اللہ نے اپنی ذرہ نوازیوں کے صدقہ ہماری وراثت میں دے دیا ہے اور جس سے ہمیں ایسی امکانی قدرت حاصل ہوئی ہے کہ ہم چاہیں تو یہاں قرآنی تصورات کے مطابق اپنی دنیا کی تشکیل کر لیں۔

(۳) منافقین، قوم پرست مسلمانوں، کے اس طائفہ کو جو کسی نہ کسی طرح تپ دق کے جراثیم کی طرح ہماری ہڈیوں کے گودے کے اندر تک پہنچ چکا ہے اور اب ناصحین مشفق کے لباس میں دشمن کی سازشوں کو کامیاب بنانے میں مصروف ہے۔ جلد سے جلد بے نقاب کر کے اپنوں سے الگ کیا جائے۔

(۴) جو نالائق اور بددیانت گروہ حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مسندِ اقتدار پر متمکن ہو چکا ہے اسے اس کی صحیح قدر و قیمت کا آئینہ دکھا کر اس کے اصلی مقام تک لوٹا دینے کا انتظام کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی نوجوان طبقہ کی تطہیرِ فکر اور تربیتِ قلب اس انداز سے کی جائے کہ وہ حکومت کے بارِ عظیم کے اہل ہو جائیں۔

(۵) گذشتہ حوادث و نوازل نے قوم کی اقتصادی حالت کو جس درجہ پست کر دیا ہے اس کا صحیح اندازہ کر کے اس کمی کو پورا کرنے کے اسباب و ذرائع پر غور کیا جائے۔

(۶) اس انقلاب کو جو اس وقت ضمیرِ عوام میں پہلو بدل رہا ہے، صحیح خطوط پر متشکل کر کے ایسی صورت پیدا کی جائے کہ یہ انقلابی روح صحیح قیادت اور متعین منزل کے فقدان سے تعمیری نتائج مترتب کرنے کی بجائے مزید تخریب و اختلال کا موجب نہ بن جائے۔ اس کے لئے عوام کے قلب و نگاہ کی تربیت، منزلِ مقصود کی واضح اور غیر مبہم تعیین اور اس تک پہنچا لے جانے والے صراطِ مستقیم کی روشن نشان دہی کی جائے۔

(۷) اربابِ اقتدار کو بتایا جائے کہ وہ اپنا نصب العین جذبۂ حکومت کی تسکین کی بجائے فریضۂ خدمت کی ادائیگی قرار دیں۔ اور عوام کو سمجھایا جائے کہ وہ اپنے حقوق کے مطالبے کے ساتھ ساتھ اس اہم حقیقت کو بھی فراموش نہ کریں کہ ان کے صرف حقوق ہی نہیں بلکہ کچھ فرائض بھی ہیں اور حقوق تو

مواہب کا مستحق بھی وہی ہوتا ہے جو اپنے فرائض کو بطریق احسن بجا لاتے۔

(۸) جو خطرہ اس وقت سر پر منڈلا رہا ہے اس کی مدافعت کے لئے پوری کی پوری قوم کو تیار کر دیا جائے اس لئے کہ اگر یہ خطۂ زمین ہی نہ رہا تو ہم بھی نہ رہ سکیں گے۔

(۹) اور ان مساعی کا ماحصل یہ ہو کہ جس غرض کے لئے یہ زمین کا ٹکڑا ہم نے حاصل کیا ہے، (یا بالفاظ صحیح ہمیں اس مبدا فیض و کرم کی موہبت کبریٰ سے عنایت ہوا ہے) وہ غرض بطریق احسن پوری ہو جائے۔ اور وہ غرض اس کے سوا اور کیا ہے کہ اس خطۂ زمین میں بسنے والا مسلمان تمام دنیا کی غیر خدائی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر فقط ایک اللہ کا محکوم ہو کر زندگی بسر کر سکے۔ اور اس طرح پھر سے اس آئین کہن کو تازہ کر دے جسے چشم فلک نے ایک بار دیکھا اور اسے دوبارہ دیکھنے کے لئے آج تک سرگرداں ہے۔

ان حسین آرزوؤں اور مقدس تمناؤں کو لے کر طلوع اسلام پھر جادہ پیما ہوا۔ کراچی کی اشاعت اول میں جو سال گزشتہ کے دو ابتدائی مہینوں یعنی جنوری اور فروری کی مشترکہ اشاعت تھی بتسلسل فکر کے لئے "پس منظر" کے تحت مختصر اس دور کا جائزہ لیا گیا جس میں طلوع اسلام شائع ہوتا رہا بلکہ اس خلا کو بھی پر کرنے کی کوشش کی گئی جو عالمگیر جنگ سے پیدا شدہ حالات کے تحت طلوع اسلام کے بند ہو جانے سے پیدا ہو گیا تھا۔ یہ پس منظر مسلمانوں کی دس سالہ سیاسی جدوجہد کا جائزہ و مطالعہ تھا اور اس کی افادیت ظاہر ہے۔

برصغیر ہند کی تقسیم کے تتبع میں سابق آل انڈیا مسلم لیگ کو بھی ہندوستانی اور پاکستانی مسلم لیگوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی اجتماعی تشکیل کرنے اور اپنے ملی مسائل کا حل از خود سوچنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا گیا۔ اس فیصلہ کی تائید میں یہ دلیل پیش کی گئی کہ پاکستان اور ہندوستان کے حالات اس درجہ متغائر اور وہاں کے رہنے والوں کے تقاضے اس درجہ متباین ہیں کہ ایک مشترکہ جمعیت ان کی قیادت کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتی۔ یہ فیصلہ مسلمانوں کی جنگ پاکستان (آزادی) کے اس اٹل دعوے کے باوصف تھا کہ اسلام کی رو سے قومیت کا مدار اتحاد وطن کی بجائے مذہب پر ہے۔ طلوع اسلام کو اس کے خلاف احتجاج اور ارباب مسلم لیگ کو متنبہ کرنا پڑا کہ "حصول پاکستان کے بعد ملک دو حصوں میں ضرور بٹ گیا ہے۔ لیکن اس سے ہندوستان کے برصغیر میں بسنے والا مسلمان کبھی دو حصوں میں نہیں بٹ سکتا۔ اس لئے کہ دین کا وہ رشتہ استوار جس نے ان تمام افراد کو باہمدگر منسلک کر کے ایک قوم بنا رکھا ہے، ان میں زندہ و پائندہ بدستور موجود ہے۔" اس کے ساتھ ہی مسلمانان ہندوستان سے "بصد منت التجا" کی گئی کہ وہ ہر مصیبت کو برداشت کر لیں لیکن اپنے آپ کو پاکستان کے مسلمانوں سے علیحدہ قوم نہ بننے دیں۔ مسلمانان پاکستان کو اس ضمن میں یوں خطاب کیا گیا:۔

(مسلمانانِ ہندوستان کے مسئلہ کا حل) پاکستان کے مسلمان کی قوتِ بازو پر منحصر ہے۔ ہندوستان کے مسلمان نے پاکستان کے مسلمان کو سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کرنے کی امکانی قوت حاصل کرنے میں پورے ایثار و قربانی سے کام لیا۔ اب پاکستان کے مسلمان کا فرض ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کو عزت و احترام کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنائے۔ اور اس طرح دونوں ایک دوسرے کے دست و بازو بنے رہیں۔

یہ مسئلہ تو پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کا تھا۔ لیکن خود پاکستان میں صوبائی تعصب کی کارفرمائی نظر آ رہی تھی۔ سندھ کے مرکز کراچی میں پاکستان کا مرکز قائم ہو جانے سے صوبائی جسدِ سیاست میں ہند کا داخل کردہ زہر رنگ لا رہا تھا۔ اور سندھی اور غیر سندھی کا مردود سوال پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ طلوع اسلام نے مسلمانانِ پاکستان کو اس خطرہ سے بھی آگاہ کیا اور اس سے بچنے کی تلقین کی۔ کسی ایک فریق کو موردِ الزام قرار دینے کے بجائے طلوع اسلام نے سندھیوں اور غیر سندھیوں دونوں سے خطاب کرتے ہوئے لکھا:

(۱) ہم سندھی مسلمانوں سے گزارش کریں گے کہ سندھی اور غیر سندھی کی تفریق یکسر غیر اسلامی ہے۔ اس لئے وہ جتنی جلدی اس عصبیت کو اپنے دل سے الگ کر دیں اتنی ہی جلدی وہ حقیقی اسلام سے قریب آ جائیں گے۔

(۲) غیر سندھی مسلمانوں سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے حسنِ سلوک اور مروّت و اخلاق سے ایسی کشادہ دلی اور وسیع القلبی کا ثبوت دیں کہ سندھ کا مسلمان انہیں اپنا سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔

(۳) حکومتِ سندھ کے اربابِ بست و کشاد سے عرض کریں گے کہ وہ دورانِ نظم و نسق میں کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے دیں جس سے ذرا بھی مترشح ہو سکے کہ یہاں سندھی اور غیر سندھی میں تمیز کی جاتی ہے۔ اور

(۴) مرکزی حکومت کے عمائدین اور اراکین سے التماس کریں گے کہ جب آپ کے انتخاب کی بنا پر کراچی ایک ہمہ گیر شہر کی حیثیت اختیار کر رہا ہے تو اب یہاں کے انتظامی امور میں ایسی دلچسپی لیں کہ یہ بلد امین سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ (۲۲/۲۵) (یہاں کے رہنے والے اور باہر سے آنے والوں کے لئے بالکل یکساں) کا مصداق بن جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس تنبیہ کو عام کر دیں کہ

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۲۲/۲۵)

جو کوئی اس میں ظلم کے ساتھ ناانصافی کا ارادہ کرے گا ہم اسے دردناک سزا کا مزہ چکھائیں گے۔

قیام پاکستان کے ساتھ ہی مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دیگر گوشوں میں مسلمانوں پر جو قیامت گزری اس سے قوم میں خوف و ہراس پھیل جانا ناگزیر تھا۔ اس ہمہ گیر ہراس میں قرآن ایسی قوم کے لئے جو "دشمنوں کے خوف سے اپنے گھر بار چھوڑ کر بھاگ آئے" کیا لائحہ عمل تجویز کرتا ہے؟ اس سوال کا جامع جواب علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ نے اپنے مختلف مضامین میں دیا جو "قرآنی تعلیم" کے زیرعنوان، طلوع اسلام کی متعدد اشاعتوں کی زینت بنے۔ علامہ محترم کے الفاظ میں:

> قوموں کے اوپر کبھی کبھی ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ پریشانی اور بدحواسی میں ان کے دلوں پر خوف چھا جاتا ہے، اور دشمنوں کے مقابلہ میں اُن کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں اور وہ جان سے کر بھاگ نکلتی ہیں۔ ایسی حالت میں قرآنی تعلیم یہ ہے کہ ان کو ہمت کر کے اللہ کے بھروسہ پر جان دینے اور جہاد کرنے کیلئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ پھر اللہ ان کو زندگی یعنی دشمنوں پر غلبہ عطا کر دے گا۔ ایسی قوم میں جو لوگ دولت والے ہوں اُن سے اللہ فرماتا ہے۔
>
> من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا فیضعفہ لہ اضعافا کثیرۃ واللہ یقبض ویبسط والیہ ترجعون ٥
>
> وہ کون ہے جو اللہ کو خوش دلی سے قرض دے تو اللہ اس کو اس کے لئے کئی گنا بڑھائے گا۔ اور اللہ ہی تنگی و فراخی دیتا ہے۔ اور اسی کی طرف تم کو پلٹ کر جانا ہے۔
>
> پہلے جان دینے کا حکم دیا، کیونکہ دنیا میں جو قوم جان دینے کے لئے تیار نہ ہوگی وہ اپنے دین و ناموس کو محفوظ نہ رکھ سکے گی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دشمنوں سے لڑنا یا ان پر چڑھائی کرنا بے ساز و سامان کے نہیں ہو سکتا جس کے لئے مال کی ضرورت ہے۔ اس لئے نہایت خوش اسلوبی سے جہاد میں خرچ کی ترغیب دی کہ جو کچھ اس میں دو گے وہ اپنے مالک کو قرض حسنہ دو گے جس کا کئی گنا وہ تم کو دے گا۔

ایسے ماحول میں یہ پیغام امید و عمل ہی مسلمانوں میں ہمت و استقامت پیدا کر سکتا تھا، اور للہ الحمد کہ طلوع اسلام نے روز اول سے ہی اس اہم ترین نکتہ کو نمایاں کیا اور قوم کو اس کی طرف دعوت دی۔

طلوع اسلام کی اشاعت اوّل سے بہت پیشتر کشمیر کا جہاد حریت شروع ہو چکا تھا اور کشمیر کی جنت ارضی سرفروشان حریت و جانبازان آزادی کے خون سے زعفران زار بننا شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ اشاعت اوّل کا انتساب بارہ سولہ برس کے اس گمنام مجاہد کے مقدس قطرات خون سے کیا گیا جو محاذ جنگ سے زخمی حالت میں ہسپتال میں علاج کے لئے آیا۔ لیکن مجاہدوں کے نعرہ بڑھو کے نعرے سن کر علاج کے لئے ہسپتال میں رک نہ سکا اور راکفل کا سہارا لیکر اٹھ کھڑا

ہوا اور پھر محاذ جنگ کی طرف چل دیا۔ یہ انتساب محض رسمی نہ تھا بلکہ طلوع اسلام کو مسلک زندگی کا بے تابانہ مظاہرہ!

انگریزی عملداری ختم ہونے اور آزادی کی صبح طلوع ہوتے ہی حکام اور عوام کے باہمی رشتہ و مقام میں جو بنیادی تبدیلی واقع ہونی چاہیئے تھی، اس کی طرف توجہ منعطف کراتے ہوئے حکام سے خطاب کیا گیا

انگریز چلا گیا، لیکن اس کے نظام حکومت نے تمہارے قلب و دماغ کو جن سانچوں میں ڈھال دیا تھا، تم نے اسے بدستور قائم رکھا ہے۔ بلکہ وہ برائیاں جو پہلے پھر بھی کسی حد تک، انگریز کے خوف یا شرم سے، دبی دبی سی رہتی تھیں، ابھر اور نکھر کر اوپر آگئی ہیں...... وہی اپنوں سے بیگانگی اور منافرت، وہی مصنوعی رعب و داب، وہی خوشامد پرستانہ مسلک، وہی فریب کارانہ مشرب وہی حیلہ جوئی اور کام چوری، وہی نالائقی اور نااہلی، وہی خیانت و بد دیانتی، وہی اقربا پروری و جنبہ داری، وہی ظلم و استبداد، وہی جور و ستم..... یاد رکھو، اگر تم نے خود اپنے آپ کو نہ بدلا تو خدا کا دیا لینے والا قانون تمہیں بدل دے گا اور اس کا بدلنا ایسا ہوتا ہے کہ اس میں تختہ الٹ جایا کرتا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (۱۱/۸۲)

پس جب (قانون مکافات عمل کے مطابق) ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے بالادستوں کو زیر دست بنا کر رکھ دیا۔

حکام کو انتباہ کرنے کے بعد عوام کو بتایا گیا کہ

وہ حکومت ختم ہو گئی جس کے خلاف تمہیں قانون شکنی اور عدول حکمی کے لیے بھڑکایا جاتا تھا۔ اب اس کی جگہ تمہاری اپنی حکومت آگئی۔ لیکن تم نے اس قانون شکنی اور ضابطہ فراموشی کی روش کو معمول حیات، اور حکم عدولی اور نافرمانی کے مسلک کو عین آزادی سمجھ رکھا ہے اور اب تک تمہاری یہ حالت ہے کہ ذرا کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی فوراً غضب آتش ہو گئے۔ ذرا سوچو کہ اس طرح دنیا میں کوئی نظم قائم اور کوئی حکومت مستحکم ہو سکتی ہے؟..... اگر قانون غلط ہے تو اسے صحیح قانون سے بدلنے کی کوشش کرو۔ لیکن قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر بے آئینی کا انتشار نہ پیدا ہونے دو کہ اس انتشار سے دشمن، جو تمہاری گھات میں بیٹھا ہے فائدہ اٹھا جائے گا اور تمہاری یہ حالت ہو جائے گی جیسے ایک نوزائیدہ چڑیا کا بچہ اپنے گھونسلے سے نیچے گر جائے۔

تَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ (۲۲/۳۱)

سو اسے چیلیں اور کوّے (جس کا جی چاہے) اچک کر لے جائیں۔ یا آندھی کا جھکڑ اسے

اس کے مامن و مسکن سے کہیں دور پھینک دے۔

---

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو دہلی میں وہ حیرت انگیز حادثہ وقوع پذیر ہوا جو بظاہر ہندوؤں کی اہنسا کی دعویدار قوم کی طرف سے ناقابلِ یقین معلوم ہوتا تھا۔ ہندوستان کا وہ غیر معمولی اہنسا کا اوتار، جس کے بت اس کی زندگی میں ہی ہندوستان کے بعض مندروں میں بغرضِ پرستش نصب ہو گئے تھے۔ اپنی ہی قوم کے ہاتھوں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ یہ قتل جتنی بڑی شخصیت کا تھا اسی تناسب سے گہری سازش کا نتیجہ بھی تھا۔ یہیں راشٹریہ سیوک سنگھ کی بے پناہ تنظیمی قوت کا مالک ہو چکا تھا۔ اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ گاندھی کی تھی۔ گاندھی کے بغیر وہ ہندوستان کا بلاشرکت غیرے حکمران ہوتا! چنانچہ نہایت بیدردی سے اس روڑے کو راہ سے ہٹا دیا گیا۔ ہر چند گاندھی سے مسلمانوں کو چنداں بلند توقعات نہ تھیں، لیکن گاندھوی اندازِ سیاست میں مسلمانانِ ہندوستان کے لئے مصلحتاً امان کی گنجائش تھی۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے بے لگام ہو جانے سے مسلمانوں کا استیصال ناممکن الحصول نہیں تھا۔ ادھر حکومتِ ہندوستان نے ان کی زندگی اجیرن کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ فرقہ وارانہ جماعتیں، ناقابلِ برداشت، کہی جانے لگیں۔ سیوک سنگھ کے ساتھ مسلم لیگ نیشنل گارڈ ز ایسی بے ضرر اور بے جان جماعت کو بھی خلافِ قانون قرار دیدیا گیا۔ مسلمانوں کو مسلم لیگ دفن کر دینے کے مشورے دیئے جانے لگے۔ سابق لیگی کارکنان کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ اس ہنگامۂ دار و گیر میں مسلمان، جن کے حوصلے پہلے ہی پست ہو چکے تھے، عجیب انتشارِ ذہنی کا مظاہرہ کرنے لگے۔ گاندھی کی تعریف میں غلو سے کام لیا گیا۔ حتیٰ کہ ازرہِ بے خردی اسے "نیم مسلمان"، "پیغمبر" تک کہا جانے لگا۔ طلوعِ اسلام نے ان رجحانات ہی کا جائزہ لیتے ہوئے مسلمانانِ ہندوستان کی اس مداہنت پر اظہارِ تاسف و تعجب کیا اور انہیں بتایا کہ زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں بلکہ زندگی غیرت اور عزت کی زندگی کا نام ہے۔ اگر عزت اور غیرت محفوظ ہیں تو سب کچھ محفوظ ہے۔ اور اس کے تحفظ کا راز ایمانِ محکم اور عزمِ راسخ میں ہے۔ ہندوستان کی حکومت سے رفاہِ عامہ اور فلاح و بہبودِ انسانی کے جملہ کاموں میں تعاون کیا جا سکتا ہے لیکن اپنی حیاتِ اجتماعیہ کی بقا اور تصوراتِ زندگی کی نگہداشت ازحد ضروری ہے۔

اشاعتِ اول میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۸ء تک کے واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے محسوس کیا گیا کہ تقسیمِ ہند سے متعلق کوائف کا آئینی پہلو تشنہ رہ گیا ہے۔ اس جائزہ میں یقیناً اس سے زیادہ ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے "تقسیمِ ہند کا آئینی پہلو" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ پیش کیا گیا جو دو قسطوں میں شائع ہوا۔ اس مقالہ میں کرپس تجاویز ۱۹۴۲ء سے لے کر (کہ اس میں پہلی بار مطالبہ پاکستان کی بے پناہی کا اعتراف کرتے ہوئے برطانوی حکومت نے "علیحدگی" کی "گنجائش" پیدا کی تھی) جون ۱۹۴۷ء کے اعلان تک ذکر۔ اس کی مدد سے

تقسیمِ ہند عمل میں آئی) جملہ دستاویزات آئینی کا جامع مطالعہ تھا۔ مسلمانوں کا سیاسی ادب ہنوز اپنے موقوں اور بے لاگ جائزوں سے بہت حد تک تہی ہے۔ "پس منظر" اور "تقسیمِ ہند کا آئینی پہلو" دونوں مضامین مربوط شکل میں سیاست ملی پر قابلِ قدر اور دستاویزی تبصرہ ہیں۔

برصغیرِ ہند کی گذشتہ دس سال کی سیاست ایک یقینی منزل کی طرف رہنمائی کرتی تھی۔ ہندو بہ لطائف الحیل اس رجحان کا بطلان کرتا رہا۔ بقول گاندھی تقسیمِ ہندو بھارت دگئو ماتا کی تقسیم کے مترادف تھی، لہٰذا ہندوؤں کے نزدیک اس کی ہر ممکن طریق سے مخالفت دھرم کا جزو تھی۔ چنانچہ ہندو نے پہلو بدل بدل کر پاکستان کے مطالبہ کو ٹھکرایا۔ لیکن بالآخر جب وہ مجبور ہو گیا اور اسے تقسیم قبول کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا تو اس نے یہ کڑوی کسیلی گولی نگل تو لی مگر اس کا کام و دہن اس تلخی کو اب تک فراموش نہیں کر سکا۔ ہندو نے پاکستان کو تو قبول کر لیا۔ مگر صوبجات پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فتنہ کھڑا کر دیا۔ یہ تقسیم اس انداز سے ہوئی کہ مسلم اکثریت کے علاقے بھی ہندوستان میں شامل ہو گئے جس سے وہاں کے مسلمانوں کو ہندو اور سکھ غارتگری کا شکار ہونا پڑا۔ اس سازش کو مکمل کرنے کے لئے رسوائے عالم لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وہ عاجلانہ اقدامات کئے کہ آزادی کی معین تاریخ سے ایک سال قبل ہی تقسیم مکمل کرا دی۔ ارباب مسلم لیگ جو ارباب حکومت پاکستان بن چکے تھے، اس عجلت اور اعصابی جنگ کا شکار ہو گئے۔ وہ جشن آزادی کی تیاریوں اور مسرتوں میں مصروف تھے کہ ہندو نے موجبات و املاک اور فوجی ساز و سامان تقسیم کئے بغیر حکومت پاکستان کا مرکز دہلی سے کراچی منتقل کرا دیا۔ اس طرح ایک نیا ملک اس انداز سے معرض وجود میں آیا کہ اس کی حدودِ مملکت غیر متعین تھیں۔ اس کا سرمایہ اور فوجی ساز و سامان و اسلحہ ہندوستان کے قبضہ میں تھا۔ پاکستان لازمی طور پر بیچارہ ہو گیا۔ اس کامیابی نے ہندوؤں کو اور شہ دی۔ طلوعِ اسلام نے آگست کی اشاعت میں ان غلطیوں کا بعد خراشِ جگر تجزیہ کیا اور ارباب اقتدار کو دعوت دی کہ وہ اپنی غلطیوں کا کشادہ دلانہ اعتراف کریں اور ان کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل مرتب کریں تاکہ آیندہ کے لئے ان کا مداوا ہو سکے۔ مقالہ "محاسبۂ نفس" اس اعتبار سے خصوصی توجہ کا مستحق تھا کہ اس میں امعان نظر سے اور پوری ذمہ داری اور جرأت کے ساتھ اپنی غلطیوں پر محاسبہ کیا گیا تھا۔ اور اس محاسبہ سے مقصود تخریب نہ تھا بلکہ آیندہ کے لئے احتیاطی تدابیر کا تقاضا۔

مسلمانانِ ہند کا مطالبہ پاکستان مقصود بالذات نہ تھا۔ بلکہ ایک بلند و بالا مقصد عظیم القدر کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اصل مقصود یہ تھا کہ ہم اپنی زندگی کو قرآنی خطوط پر متشکل کر سکیں۔ حکیم الامت کے الفاظ میں:-

زندگی اپنے حوالی میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں

میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی خارجی دنیا وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود انسانوں کی ضمیر میں متشکل نہ ہو۔

اس کے لئے ضروری تھا کہ حصول خطۂ ارض کی کوششوں کے ساتھ ساتھ نگاہوں کے سامنے وہ خاکہ بھی رکھتے چلے جائیں جس کے مطابق اس خطۂ ارض پر ایک جدید عمارت کی تعمیر ہونی تھی۔ خطۂ ارض یعنی پاکستان کے حصول و قیام کے بعد ہی یہ سوال سامنے آگیا کہ اپنی زندگی کو قرآنی خطوط پر کیسے متشکل کیا جائے۔ اس سوال کی حقیقی صورت صحیح تر الفاظ میں یہی کہ آخر قرآنی خطوط ہیں کیا؟ ایک ہزار سال سے ملت مسلمہ جن ذہنی اطواق و سلاسل میں جکڑی چلی آ رہی تھی، انہوں نے وحدتِ فکر و مرکزِ خیال کا کوئی نقطہ باقی نہیں رہنے دیا تھا۔ قیام پاکستان نے اس انتشارِ ذہنی کو اور ہوا دی۔ جب قرآنی نظامِ حیات کی اساس و جزئیات سوچنے کا موقع آیا تو جتنے منہ تھے اتنی باتیں ہونے لگیں۔ اور ہر بات دوسری بات سے جدا اور مختلف تھی۔ مسودۂ آئین کا فریضہ بہر نوع مجلس دستور ساز کا تھا۔ چنانچہ اشاعتِ اول میں ہی محترم ارکان مجلس سے گزارش کی گئی کہ وہ اس عظیم القدر فریضہ کو محسوس کریں اور پوری ذمہ داری سے کام لیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اسلامی دستورِ حیات کی جو بوقلموں اور روز روز کا توجیہیں شروع ہوئیں اور ارباب مذہب کی طرف سے مذہب (اسلام!!) کے نام پر جو سطحی اور بے خردانہ مطالبات پیش ہوئے اس کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام کا قلم اس موضوع پر پھر جنبش میں آیا اور یہ ثابت کرنے کے بعد کہ جب ہم اسلام کا نام لیتے ہیں تو بتقاضائے فادخلوا فی السلم کافۃ اس سے مراد پورا اسلام ہوتا ہے نہ کہ اس کی چند جزئیات، ارکان مجلس سے گزارش کی گئی کہ مسئلہ بالکل سیدھا اور سادہ ہے۔ اگر ارکان مجلس قرآنی نظام و آئین کی ترویج کے متمنی ہیں تو انہیں بلا تاخیر ذمہ دارانہ اور واضح اعلان کر دینا چاہیے کہ مملکت پاکستان میں قرآنی نظام کا قیام ہوگا۔ اس کے بعد ہمارا کام آئین کی تاسیس نہیں رہے گا، کیونکہ ہمارے پاس ایک مکمل ضابطہ (قرآن) موجود ہے بلکہ ہمارا کام اس کی تنفیذ ہوگا۔

طلوعِ اسلام نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ مجلس دستور ساز سے اس واضح اعلان کا مطالبہ کرے اور تا عشرِ اب کے جواب کے انتظار میں اپنی عمر بڑھانے کا طریق خوب سوچ لے۔ بلکہ محترم غلام احمد پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہما العالی ایسے عالمانِ دین و قرآن، کہ جن کی خصوصی توجہات کا فراست و وہبی زندگی میں بھی حاصل رہا، کی تفسیر دینی کا فریضہ لے لیا۔ جناب پرویز نے وراثتِ ارض کا ابدی قانون "الکوثر" قرآن کا قانون صالحیت کے اساسات و تقاضا آت کا سیر حاصل جائزہ لیا۔ علامہ محترم نے اپنے خصوصی انداز میں پھر موجودہ مشکلات کا حل قرآن کے روشنی میں تلاش کر کے قوم کو سمجھایا۔ علامہ موصوف کا یہ مقالہ ان کے پچھلے مقالہ کی دوسری کڑی تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ سلسلہ کافی آگے بڑھا اور حضرت علامہ نے بیشتر ملی مسائل کو قرآن کی روشنی میں جائزہ لیا۔ پرویز صاحب کے سلسلہ کی پہلی کڑی وراثت ارض کا ابدی قانون تھی اس کی دوسری کڑی جو جولائی کی اشاعت کی زینت بنی اور جس کی افادیت کے پیش نظر اسے بعد میں علیحدہ پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا۔ "اسلامی نظام" تھا۔ اس سلسلہ کی اور کڑیاں "متاعِ دین کی ملاقات" اور "نظامِ شریعت کی بنیاد" ہیں جو علی الترتیب ستمبر اور اکتوبر کی اشاعتوں میں تشنگانِ علمِ قرآن کی سیرابی کا موجب بنیں۔ انشاء اللہ

طلوعِ اسلام آئندہ بھی اس جوئے رواں سے سیراب و شاداب رہے گا۔ جناب پرویز نے ایک ضمنی سلسلہ اس اہم سلسلہ کی تشریح و تبیین میں شروع کیا۔ قارئین طلوعِ اسلام "سلیم کے نام ..." کے عنوان سے خوب واقف ہیں۔ یہ دلی کی بھی یادگار ہے۔ ان مکتوبات میں تفصیل طلب گوشوں کو عام فہم پیرایہ میں بیان کیا جاتا ہے، اور جس خطیبانہ اور ادیبانہ انداز سے کیا جاتا ہے وہ پرویز صاحب ہی کا حصہ ہے۔

پرویز صاحب کے دو اور مضامین "عالمِ اسلامی میں حج کی اہمیت" (نومبر) اور "عالمِ اسلام" (دسمبر) بھی بعد میں شایع ہوئے۔ یہ مضامین دراصل ان کی تقاریر تھیں جو ریڈیو پاکستان، کراچی سے نشر ہوئیں۔ طلوعِ اسلام نے انہیں ریڈیو سے باقاعدہ اجازت حاصل کرکے انہیں شایع کیا۔ پرویز صاحب کے دیگر مضامین کی طرح یہ مضامین بھی گہری توجہ کے مستحق ہیں۔

پاکستان کا دفتری نظام کس قدر کاغذی اور بیجان ہے اس کے متعلق اس واقعہ کی یاد بھی تازہ کرلیجئے جو سنجیدہ اور سنگین نہ ہوتا تو دلچسپ لطیفہ ہوتا۔ اشاعت مارچ میں ہم نے حکومتِ پاکستان کی سرکاری فہرستِ تعطیلات کا جائزہ لیتے ہوئے اس فروگذاشت پر اظہارِ افسوس کیا کہ ۲۱ اپریل یعنی حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے یومِ وفات کو عمومی تعطیل قرار نہیں دیا گیا۔ اور مطالبہ کیا کہ حکومت اس کی تلافی کرے۔ حکومت کی خاموشی پر اپریل کی اشاعت میں اس مطالبہ کو دہرایا گیا اور حسبِ معمول وزیرِ داخلہ کو طلوعِ اسلام کی متعلقہ تحریریں بغرضِ مطالعہ بھیجی گئیں۔ جنابِ وزیر صاحب تو اس معاملہ میں خاموش رہے لیکن ان کے دفتر کے ایک صاحب کے دستخطوں سے طلوعِ اسلام کے نام ایک مراسلہ آیا جس میں طلوعِ اسلام کی معلومات میں یوں اضافہ کیا گیا کہ تعطیلات کی فہرست پورے غور و خوض کے بعد کابینہ کی منظوری سے شایع کی گئی تھی۔ اس فہرست میں مزید اضافہ اب بعد از وقت ہے۔ اس مراسلہ میں وعدہ تھا کہ آئندہ سال اس امر کا لحاظ رکھا جائے گا۔ گویا کابینۂ پاکستان کے نزدیک علامہ اقبالؒ جنہوں نے پاکستان کا تصور ملتِ اسلامیہ کو دیا، وہ تصور جس کی تجسیمی شکل اختیار کئے بغیر آج وہ سانیہ حکومت پر متمکن نہ ہوتی، ان کا یومِ وفات کوئی ایسا یوم نہیں تھا جسے از خود عمومی تعطیل قرار دیا جاتا۔ نیز ۲۱ اپریل کو کہ اس مراسلہ پہ تاریخ ثبت تھی، ایسا اقدام دشوار تھا۔ طلوعِ اسلام کی طرف سے جواباً حکومت کو یاد دلایا گیا کہ اگر حکومت یہ یوم کوئی یوم سمجھتی ہے تو وہ اس قلیل وقت میں بھی اپنی غلطی کا ازالہ کرسکتی ہے۔ مثلاً اس نے گاندھی کے قتل کی خبر سننے کے چند گھنٹے بعد یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ دوسرے دن سرکاری دفاتر بند رہیں۔ اگر گاندھی کے لئے چھٹی کا فیصلہ چند گھنٹوں میں ہو سکتا ہے تو یومِ اقبالؒ میں تو کم از کم ایک ہفتہ باقی تھا۔ اس کے جواب میں ۲۰ اپریل کو طلوعِ اسلام کے نام مندرجہ ذیل مراسلہ وزارتِ داخلہ سے انہی صاحب کے دستخطوں سے موصول ہوا۔

"تشکیلِ پاکستان کے بعد ۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء علامہ اقبالؒ کی پہلی برسی کا دن ہوگا۔ حکومتِ مرکزیہ پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ نظریۂ پاکستان کے لئے مرحوم کے لئے بے مثال عطایا کی یاد میں

اس دن تمام دفاتر بند رہیں۔"

علامہ اقبالؒ کے یوم وفات سے متعلق یہ استہزا موجودہ حکومت پاکستان کو ہی زیب دے سکتا تھا! خدا نہ کرے کہ اس سال پھر اس کا اعادہ ہو۔

پاکستان قائم ہو جانے سے ہمارے ملی مطالبات و مسائل کی نوعیت یکسر بدل جانی چاہیئے تھی کیونکہ ہم پاکستان میں صاحب اقتدار ہیں اور پوری طرح آزاد۔ لیکن چونکہ یہ آزادی اس انقلاب کا خارجی وجود نہیں تھا جو ضمیر انسانی کی گہرائیوں سے ابھرا ہے۔ اس لئے ملت اسلامیہ پاکستانیہ ذہنی اعتبار سے اب تک آزادی سے ہمکنار نہیں ہو سکی۔ چنانچہ اس کے نزدیک ملی مسائل کی نوعیت وہی ہے جو دور غلامی میں تھی۔ ان ہی مسائل میں سے ایک مسئلہ واحد نمائندہ سیاسی جماعت کا ہے۔ ہندوستان میں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مسلمانوں کی اکثریت مطالبہ پاکستان کی مؤید ہے یہ ضروری تھا کہ ان کی نمائندگی کا حق صرف ایک سیاسی جماعت کو حاصل ہو۔ یہ حق مسلم لیگ کو حاصل ہوا لیکن پاکستان حاصل کر لینے کے بعد مسلم لیگ کی یہ پوزیشن بدل جاتی ہے۔ اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ تمام کی تمام ملت اسلامیہ پاکستان نظام حکومت میں شریک اور موثر ہو۔ ایک سیاسی جماعت کا تصور بوجوہ مستحسن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر ایک ہی سیاسی جماعت کو اجازت دی جائے تو جملہ ملت کو محیط نہیں ہو سکتی۔ ملت کا معتدبہ حصہ اس کے حلقہ میں بوجوہ شریک نہیں ہو سکتا۔ اور پھر ایک طبقہ ایسا ضرور رہ جاتا ہے جو اس واحد جماعت کے طریق کار و لائحہ عمل سے اتفاق نہیں رکھتا آئینی جمہوریت میں ایسے طبقہ کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ حزب مخالف کی تشکیل کر لے۔ لیکن ایک حزب کی اجازت سے فتنوں کے کئی دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس سے لامحالہ کئی احزاب معرض وجود میں آجائیں گے۔ جس سے ملت تشتت و افتراق کا شکار ہو جائے گی۔ نیز وہ سیاسی جماعتیں اپنے جماعتی تفوق و تغلب کے لئے جائز و ناجائز ذرائع سے کام لیں گی جس سے اجتماعی نظام کی اخلاقی قدروں کو ضرور نقصان پہنچے گا۔ اگر کسی ایک بھی حزب مخالف کی اجازت نہ دی جائے تو واحد سیاسی جماعت سیاسی اقتدار کی واحد اجارہ دار بن جائے گی جو جماعتی آمریت کا پیش خیمہ ہوگا۔ ان حالات میں ملت اسلامیہ کے لئے کیا طریق کار ہے؟ طلوع اسلام نے اس ضمن میں پاکستانی سیاست میں ایک نئے تصور کی بنیاد رکھی۔ مئی کی اشاعت میں لیگ کی تنظیم نو کا جائزہ لیتے ہوئے اس نئے تصور کو پیش کیا گیا کہ ملت کو بذات خود ایک جماعت سمجھا جائے اور اس میں مزید پارٹیوں کی گنجائش نہ رکھی جائے۔ یعنی ملت میں سرے سے کوئی پارٹی تسلیم ہی نہ کی جائے۔ اور نظام حکومت کو اس قدر عوامی اور جمہوری بنایا جائے کہ ساری کی ساری ملت شریک حکومت ہو جائے ملت کا ہر فرد نظام حکومت سے متعلق ہو اور وہ حسب استطاعت و استعداد اسے متاثر کر سکے۔ وہ نظام اجتماعی کا ایک زندہ عامل ہی نہ ہو، بلکہ اس کا خود ہی محاسب بھی ہو۔ اس مقالہ کو "مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے" کے عنوان سے علیحدہ پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔ تاکہ اس نظریہ کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو سکے۔ مئی کے بعد کی اشاعتوں میں مختلف شکلوں سے اس نظریہ کی مزید وضاحت کی گئی۔

فلسطین کی ارضِ مقدس یوں تو برسوں سے مسلمانانِ عالم کی توجہات کا مرکز بنی رہی تھی۔ لیکن مئی ۱۹۴۸ء میں اس مسئلہ کی اہمیت و نزاکت بنہایت بڑھ گئی۔ انگریز نے نہایت شاطرانہ انداز سے اعلان کر دیا کہ وہ مارچ سے انتدابِ فلسطین ختم کر دے گا۔ اس کے بعد فلسطین کے مستقبل کی تمام تر ذمہ داری اقوامِ متحدہ کی ہوگی، اور برطانیہ ان کے فیصلہ کو قبول کرے گا۔ یہاں تک تو خیر کچھ بات نہ تھی لیکن انگریز نے جس نہج سے فلسطین سے کنارہ کشی اختیار کی وہ از حد جانبدارانہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہودی فلسطین کے قابلِ ذکر رقبہ اور اہم مقامات کے مالک بن گئے۔ اس طرح انگریز کی اعانت سے فلسطین میں نام نہاد اسرائیلی حکومت قائم ہو گئی۔ اختتامِ انتداب پر یہودیوں اور عربوں میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ درحقیقت بین الاقوامی جنگ کی خیالی صورت تھی۔ کیونکہ عرب طاقتیں دنیا کی دولِ عظمیٰ کے خلاف برسرِپیکار تھیں۔ فلسطین میں یہودی سلطنت کا وجود امنِ عالم کے ہی منافی نہ تھا بلکہ عالمِ اسلامی کے لیے مستقل خطرہ تھا۔

ہرچند فلسطین کا معاملہ پہلی جنگِ عظیم کا پیدا کردہ ہے۔ تاہم ہمارے ہاں اس سے متعلق معلومات کی ہمیشہ کمی رہی ہے۔ طلوعِ اسلام نے محنت اور کاوش سے ایک مقالہ موسوم بہ "فلسطین" مرتب کیا جس میں مسئلہ کے تاریخی و سیاسی پس منظر کو جامعیت سے آشکارا کیا گیا اور عربوں اور یہودیوں کے متضاد مطالبات کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا۔ وسعتِ معلومات کے اعتبار سے یہ مقالہ ہمارے سیاسی لٹریچر میں اپنی نظیر آپ ہے۔ کیونکہ ہنوز ہمارے ہاں ایسے سنجیدہ اور ٹھوس مقالات نایاب ہیں۔ یہ مبسوط مقالہ بہ تمام جون کی اشاعت میں شائع ہوا۔ جولائی کی اشاعت میں علامہ اسلم جیراجپوری کا ایک مقالہ موسوم بہ "یروشلم" شائع ہوا جس میں یروشلم کی وجہ تسمیہ اور اس کی تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا۔ یہ مضمون عالمانہ اندازِ بیان اور تبحرِ علمی کا نادر نمونہ ہے۔ مقالات "فلسطین" اور "یروشلم" درحقیقت ایک ہی کل کے اجزاء ہیں۔

عالمِ اسلام کی سیاست کے ضمن میں طلوعِ اسلام کے پیشِ نظر اور بہت سے مسائل ہیں جن کو عند الفرصت جامعیت سے پیش کیا جائے گا۔ وما توفیقی الا باللہ

---

۱۵ اگست ۱۹۴۸ء کو پاکستان کی پہلی سالگرہ تھی۔ اس دوسرے جشنِ آزادی کے موقع پر طلوعِ اسلام نے محض ہائے و ہو سے کام نہیں لیا بلکہ سال بھر کی کارگزاری پر نظرِ احتساب ڈالی اور بتایا کہ ہم سیاسی آزادی کی حدود سے آگے بڑھ کر حقیقی آزادی سے کیسے ہمکنار ہو سکتے ہیں اور ہمہ گیر عدمِ اطمینان کو دور کر سکتے ہیں۔

اسی یعنی اشاعتِ اگست میں "مختصر داستانِ پنجاب کا پس منظر" بھی پیش کیا گیا جس میں ان حالات و کوائف کا جائزہ تھا جو خضر وزارت کی شکست میں منتج ہوئے اور جنہوں نے پنجاب کو قتل و نہب کی آماجگاہ بنا دیا۔ اس مقالہ میں "مسلم لیگ کے ایک سابق کارکن" نے جتایا کہ حالات نے پنجاب کے خونیں ڈرامہ میں پارٹ ادا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ہندو اور سکھ لیڈروں کے غیر ذمہ دارانہ بیانات کو ایک داستانِ مسلسل کی صورت میں یکجا کر کے ان کی جنگی تیاری، فتنہ سامانیوں اور سازشوں کو مسلم لیگی زعماء کی غفلت شعاری، غلط امن پسندی اور قوم سے بیگانگی سے تقابل کیا۔

یہ مقالہ اس اعتبار سے بھی نمایاں افادیت کا پہلو لئے ہوئے ہے کہ اس میں ایک پرآشوب اور دور رس نتائج کے حامل دور کے چیدہ اور قابل ذکر واقعات کو مربوط و منضبط کر دیا گیا ہے۔ یہ واقعات اس قابل تھے کہ آنے والوں کے لئے بطور سند باقی چھوڑا جاتا۔

جولائی ۱۹۵۰ء میں پاکستان کے وزیر خزانہ جناب غلام محمد صاحب انگلستان تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے ایک بیان دیا جس میں آپ نے مابعد تقسیم ہند کے فسادات کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مورد الزام قرار دیا۔ نیز یہ بھی کہا کہ اس نے بعض ضلعے، اگر عاجلانہ طور پر تقسیم مکمل کرائی جس سے پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام برپا ہو گیا۔ مسٹر غضنفر علی نے بھی اس کی تائید میں ایک بیان دیا اور عوام کو بتایا کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کی جنگی تیاریوں سے خوب واقف تھے۔ اور انہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے بھی کہا لیکن انہیں ٹال دیا گیا۔ عام طور پر ان بیانات پر واہ واہ ہوئی اور پاکستانی اخبارات نے وزیر خزانہ کی جرأت کی خوب داد دی۔ طلوع اسلام نے اس معاملہ کو بالکل دوسرے پہلو سے دیکھا اور اس نے ان لیڈروں سے دریافت کیا کہ جب آپ سب کو یہ معلوم تھا کہ ہندو اور سکھ خوفناک تیاریاں کر رہے ہیں اور انگریز عاجلانہ طور پر سب کچھ کر رہا یا کرا رہا ہے تو آپ نے بلا تعین حدود کیوں پاکستان منظور کیا؟ آپ نے کیوں اپنی نقدی اور اسلحہ اور دیگر سامان حرب تقسیم کے ساتھ ہی تقسیم نہ کرا لیا؟ یا کیوں نہ ملکی تقسیم کو ساز و سامان وغیرہ کی تقسیم تک ملتوی کرایا؟ نیز اس کے علاوہ آپ نے کیوں قوم سے اس راز کو پوشیدہ رکھا اور کیوں نہ انہیں اس جنگ کے لئے تیار کیا جس کے شعلے تقسیم کے فوراً بعد آناً فاناً بھڑک اٹھے اور جس کا ایندھن مسلمان بنے۔ یہ سوال "قوم پوچھتی ہے...." کے عنوان سے اگست کی اشاعت میں شائع ہوا۔ طلوع اسلام شروع سے ہی احتساب خویش کے اصول پر کاربند چلا آ رہا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ناقابل برداشت تھا کہ اپنی غلطیوں کو دوسرے کے سر تھوپ کر نتیجِ عواقب سے بچنے کا غلط طریقہ اختیار کیا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے اعمال کی محاسب نہیں بنتی اور اپنی غلط روشوں کا کشادہ دلانہ اعتراف نہیں کرتی وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ ترقی کا اہم جزو مافات کی تلافی اور اغلاط کی اصلاح اور آئندہ کے لئے اس سے احتیاط و احتراز ہوتا ہے۔ جو قوم اپنی غلط کاریوں کو صحیح سمجھتی ہے یا انہیں غلط سمجھتی ہے لیکن ان کا ذمہ دار اغیار کو گردانتی ہے وہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دوسروں کا رونا روتی رہتی ہے۔ اور دوسری قومیں میدان کارزار میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہیں۔ طلوع اسلام نے ایک سال کی پاکستانی زندگی میں قلم کی ہر جنبش اس پر صرف کی کہ قوم میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے اعمال کو اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ کر صحیح کو صحیح کہے اور غلط کو غلط۔

اسی انداز تنقید کے حامل وہ تبصرے تھے جو طلوع اسلام نے رمضان اور عیدین کے موقعوں پر قوم کے عمل پر کئے۔ یہ ایک رنجیدہ حقیقت ہے کہ ملت اسلامیہ بحیثیت مجموعی جمود فکر کا ثبوت اب تک نہیں دے سکی۔ اس ضمن میں حکیم الامت کا یہ قول بھی نقل کیا گیا کہ "قومیں فکر سے محروم ہو کر برباد ہو جاتی ہیں" ملت اسلامیہ جیسی عالمگیر

حوادث و نوازل کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے وہ اس کے فکری اور عملی قویٰ کو بیدار نہ کر سکے تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ملت کا مقدر کیا ہے؟

ستمبر ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی مختصر سی مدت حیات میں وہ حادثہ رونما ہوا جو باعتبار نوعیت عظیم ترین حادثہ تھا۔ یہ حادثہ اس بطل جلیل کی وفات تھی جس نے دس سال کی شبانہ روز کی محنت سے تن تنہا پاکستان قائم کر لیا تھا۔ قائد اعظم محمد علی جناح اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ ملت پاکستانیہ اس حادثۂ عظیمہ پر جس قدر بھی ماتم کرے کم ہے۔ نہ جانے طبعی طور پر اس کا رد عمل آنسو اور سنبھلنے والے آنسو ہی ہو سکتے تھے۔ لیکن بقائے اصلح کی شدید بین الاقوامی جنگ میں کس قوم کے پاس اتنی فرصت ہے کہ وہ رک جائے اور رو لے؛ قومیں روتی ہیں تو قوت عمل آنسو بن کر بہ جاتی ہے۔ افراد رو سکتے ہیں قومیں نہیں رو سکتیں۔ قائد اعظم کی وفات سے ایک ہمہ گیر مایوسی طاری ہو گئی اور خود پاکستان کی بقا سے متعلق تشویش و اضطراب کا اظہار ہونے لگا۔ طلوع اسلام نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

> اگر کوئی عمارت کسی شخصیت کے ستون واحد پر استوار ہے تو اس شخص کی موت کے ساتھ ہی وہ عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ قرآن ہمیں یہ درس فلاح و کامرانی دیتا ہے کہ تمہارے مقاصد کا حصول اشخاص سے نہیں بلکہ نظام سے وابستہ ہونا چاہیئے۔ اشخاص آتے ہیں اور اشخاص جاتے ہیں، لیکن نظام کی موج رواں، اپنے زور دروں سے ہر دم رواں، پیہم جواں رہتی ہے لہٰذا تم اشخاص سے بلند ہو کر نظام کے استحکام اور استواری کی فکر کرو۔ اگر تمہارا نظام صالح ہے تو اشخاص کا آنا اور جانا تمہارے مقاصد حیات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

اس کے ساتھ ہی قرآن کا وہ نقطۂ نگاہ پیش کیا گیا جس سے وہ اشخاص کی وفات کو دیکھتا ہے۔ خود رسالت مآب کے متعلق قرآن میں ہے کہ "وما محمد الا رسول ....." آپ کی وفات پر حضرت صدیق اکبرؓ نے کا مل اطمینان قلب سے فرمایا تھا کہ "جو شخص محمدؐ کی عبودیت اختیار کئے تھا وہ جان لے کہ محمدؐ وفات پا گئے۔ لیکن جس شخص نے اللہ کی عبودیت اختیار کر رکھی تھی اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا ہمیشہ زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔" طلوع اسلام نے ملت کو پیغام امید دیتے ہوئے لکھا۔

> ہمیں پوری امید ہے کہ پاکستان بتائید قائم بھی رہے گا۔ اس لئے کہ اگر خدا کی میزان میں ہماری ہلاکت اور تباہی مقدر ہو چکی ہوتی تو وہ ہم میں اقبالؒ اور جناحؒ کبھی پیدا نہ کرتا۔ فطرت اپنے گراں مایہ جوہروں کو فنا ہونے کے لئے عطا نہیں کیا کرتی۔ اس لئے پاکستان جو اس مرد درویش کے گریہ ہائے سحری اور اس مرد کا رکے تگ و تاز شب و روز کا نتیجہ ہے ضرور کامیاب و کامراں رہے گا۔ لیکن اس امید جاں نواز کے ساتھ ساتھ ہمیں اس حقیقت کبریٰ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ خدا کے فیصلے انسانوں کے ہاتھوں سے ہی تشکل پذیر ہوا کرتے ہیں اور وہ بھی

کسی قوم کی حالت نہیں بدلا کرتا جو خود اپنے اندر انقلاب نہ پیدا کرے۔

آخر میں ارباب حکومت سے گزارش کی گئی کہ وہ عوام سے ربط پیدا کریں اور بعد و مغایرت دور کر کے ان میں شعور قومی بیدار کریں اور عوام سے کہا گیا کہ وہ اپنے اندر استقلال و استقامت پیدا کریں اور استحکام پاکستان کی وحدت مقصد سے اپنے دلوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لے جائیں، تاکہ خارجی قوتوں اور دوں کی طاقتوں سے ہم نہ صرف اپنی حفاظت کا سامان بہم کر لیں بلکہ اس دنیا پر بسنے والی خلق خدا کے لئے بھی امن و سلامتی کا ذریعہ بن جائیں۔

"یہی قائداعظم کی بہترین یادگار ہے جو تم قائم کر سکتے ہو!"

ستمبر کا پرچہ پریس میں جا چکا تھا کہ ۱۰ اگست کے ڈان میں اس تفریحی محفل کی داستان رنگین شائع ہوئی جسے زنانہ نیشنل گارڈ نے کراچی میں منعقد کیا تھا۔ چنانچہ ستمبر کی اشاعت میں ٹائٹیل کے اندرونی صفحہ پر اس کی روئداد شائع کر دی گئی اور اکتوبر کے پرچہ میں "عورت کا فریضہ زندگی" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا گیا جس میں بتایا گیا کہ قرآن عورت کا کیا فریضہ زندگی قرار دیتا ہے۔ پاکستان بن جانے پر جو فروعی مسائل عام طور پر ذہنوں کی خلش کا باعث بنے ان میں پردے کا مسئلہ نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ طلوع اسلام نے عمداً اس مسئلہ کی جانب توجہ نہ دی کیونکہ زیادہ اہم اور بنیادی اجتماعی مسائل پیش نظر تھے۔ اس تفریحی محفل سے متاثر ہو کر عورت کے فریضہ زندگی پر قلم اٹھایا گیا اسی اکتوبر کی اشاعت میں حکیم محمد حسین صاحب عرشی کا ایک مضمون بعنوان "اسلامی پردہ" بھی شائع ہوا۔ پردہ، انسانی معاشرہ کی کل کا ایک جز ہے۔ اسلامی پردہ کی حقیقت سمجھنے سے پیشتر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اسلام کس قسم کی انسانی معاشرہ کی تشکیل کا داعی ہے اور اس معاشرہ میں وہ مرد اور عورت کا کیا رشتہ اور مقام مقرر کرتا ہے۔ اس مسئلہ کو انفرادی طور پر سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش مشکور نہیں ہو سکتی۔ عرشی صاحب کا مقالہ ایک سنجیدہ کوشش تھی جس نے ارباب فکر و نظر کو دعوت دی کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

سطور بالا میں ان چیدہ چیدہ مضامین پر سرسری تبصرہ کیا گیا ہے جو علیحدہ عنوانات سے شائع ہوئے۔ لمعات کی "ہمہ گیر" تحریروں پر ابھی تک تبصرہ نہیں ہو سکا۔ درحقیقت لمعات پر تبصرہ دشوار ہے، کیونکہ ان کالموں میں حالات حاضرہ کے اتنے گوشوں اور پہلوؤں پر بحث کی جاتی ہے کہ انہیں جداگانہ عنوانات کے تحت لانا آسان نہیں۔ البتہ جو چند اہم موضوع زیر بحث آئے ان میں پاکستان کا دفتری نظام قابل ذکر ہے۔ دفتری نظام بظاہر تو دو لفظ ہیں لیکن ان میں ہمارا بہت سا اجتماعی نظام مضمر ہے۔ کیونکہ نظام کی تشکیل اور عملی ترویج کی ذمہ داری بہت حد تک اسی دفتری نظام پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام نے اس نظام پر خاص توجہ صرف کی اور اس کی مناسبت یا عدم مناسبت پر کڑی نکتہ چینی کی۔ عمومی حیثیت سے طلوع اسلام نے اس پر زور دیا کہ ارباب دفتر خدمت پاکستان کے جذبہ سے سرشار ہوں اور نخوت سے دور رہیں۔ حکومت اور ملت ایک ہی اجتماعی نظام کے

دو متضاد عناصر ہیں۔ ان میں تصادم و منافرت اس نظام کی ناکامی کی دلیل ہے۔ طلوع اسلام نے عملی تجاویز پیش کیں اور حکومت اور ملت کو معاونت پر ابھارا۔ ان عملی تجاویز کو اکٹھا کیا جائے تو خاصا مجموعہ تیار ہو جائے۔ ہم نے ایک ایک تجویز حکومت کے متعلقہ شعبہ جاتی وزراء کو بھیجی۔ وہ کس حد تک مقبول ہوئی؟ اس کا جواب وقت دے گا۔

دو ایک اشاعتوں کے لمعات میں، جماعت اسلامی کے متعلق بھی تذکرہ چھڑ گیا۔ اس ضمن میں ایک نقطہ ایسا تھا جس کی وضاحت نہایت ضروری تھی۔ عام طور پر کہا یہ جاتا تھا کہ جب طلوع اسلام کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ (۱) مسلمانوں کا نظام حیات ایک عرصے سے غیر اسلامی چلا آ رہا ہے اور (۲) پاکستان میں اسلامی نظام حیات ہی قانون مملکت ہونا چاہیئے۔ اور یہی دعاوی جماعت اسلامی کے بھی ہیں۔ تو پھر طلوع اسلام کو اس جماعت کے مسلک سے اختلاف کس بات پر ہے؟ اس استفسار کا جواب ان لمعات میں آ چکا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہ طلوع اسلام کا مسلک ہی نہیں جزو ایمان ہے کہ پاکستان کی مملکت کا آئین قرآن پر مبنی ہونا چاہیئے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے طلوع اسلام کسی ایسے اقدام کو روا نہیں رکھتا جس سے خود پاکستان کا استحکام خطرہ میں پڑ جائے۔ پاکستان سے مراد ہے وہ خطۂ زمین جس میں قرآنی نظام حیات کی تنفیذ کے امکانات ہیں۔ اگر یہ خطۂ زمین ہی محفوظ نہ رہا تو یہ نظام زندگی نافذ کہاں ہوگا؟ یہ ہے پہلی وجہ اختلاف۔

دوسرے یہ کہ اسلامی زندگی "انفرادی طور پر اختیار نہیں کی جا سکتی۔ یہ نام ہے اس ہیئت اجتماعیہ کا جس میں قرآنی نظام زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو اور اس طرح وہ فضا پیدا ہو جائے جس میں ہر فرد پاکیزہ سانس لے سکے۔ لہٰذا اگر کسی سرزمین میں اسلامی انداز زندگی کارفرما ہے تو وہ وہاں کے تمام مسلمانوں کو محیط ہوگا اور اگر انداز زندگی غیر اسلامی ہے تو وہاں کے تمام افراد غیر اسلامی نظام حیات میں مقید ہیں۔ یہ درست ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں مختلف افراد میں باعتبار اختلاف اعمال ذاتی، فرق مراتب ضرور ہوگا۔ اور اس طرح غیر اسلامی نظام حیات میں بھی بعض افراد میں ذاتی اچھائیاں پائی جائیں گی۔ لیکن جس طرح اسلامی نظام حیات میں کم اچھائیوں والے افراد غیر اسلامی زندگی کے حامل نہیں کہلا سکتے اسی طرح غیر اسلامی نظام حیات میں زیادہ اچھائیوں والے افراد، اسلامی نظام زندگی کے علمبردار نہیں بن سکتے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، اسلامی یا غیر اسلامی نظام حیات ہیئت اجتماعیہ کا نام ہے، نہ کہ انفرادی خصوصیات کا۔ لہٰذا ایک غیر اسلامی نظام زندگی میں کوئی فرد یا افراد کا گروہ اس کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ اسلامی زندگی بسر کر رہا ہے اور باقی افراد غیر اسلامی۔ ہندوستان (بلکہ اب پاکستان میں) دیگر ممالک کی طرح غیر اسلامی نظام حیات کارفرما ہے اس لئے یہاں کے تمام مسلمان ایک ہی جیسی اجتماعی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں کسی فرد یا کسی گروہ کا یہ دعویٰ کہ وہ اسلامی جماعت ہے اور اس گروہ کے باہر کے مسلمان، غیر اسلامی جماعت کے افراد، ایک بہت بڑی بنیادی گمراہی ہے۔ اس گمراہی کی ابتدا پہلے مرزائی جماعت نے کی اور اس دعوے کی دلیل میں یہ کہا کہ ان کا بانی جماعت خدا کا رسول ہے اور ایک رسول کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے متبعین کو غیر متبعین سے متمیز کر دے۔ یہی وہ گمراہی ہے جس کا اعادہ جماعت اسلامی کی طرف سے ہو رہا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس جماعت کی کوشش

یہ ہے کہ یہاں اسلامی نظامِ زندگی قائم ہو جائے۔ لیکن باوجود اس کوشش کے وہ اس کی مدعی کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ اسلامی اینڈ وو زندگی بسر کر رہی ہے اور جو مسلمان اس جماعت کے اراکین نہیں وہ غیر اسلامی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں سب مسلمانوں پر ایک ہی قسم کا نظامِ حیات مسلط ہے اور جب تک اس نظام کی جگہ اسلامی نظام مسلط نہیں ہو جاتا ہم میں سے کسی جماعت کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ وہ اسلامی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس قسم کا دعویٰ مسلمانوں میں تفریق کا موجب ہے اور اس کی بنیاد ہی غلط ہے۔

یہ ہے دوسری وجہِ اختلاف۔ اگر اسلامی جماعت ان وجوہِ اختلاف کو رفع کر دے تو ہمارا اور ان کا مقصود یعنی پاکستان میں قرآنی نظامِ زندگی کی احیاء و ترویج مشترکہ مقصد ہے۔

جن اصحاب کا ذکر اوپر آچکا ہے ان کے علاوہ ادارہ حکیم حیدر زمان صدیقی، سید علی جان مشہدانی، ڈاکٹر عبدالمجید دہومیوپیتھ، مجاہد ابو سعید فضل الٰہی خادم، ممتاز حسن، پروفیسر محمد موسیٰ خان کلیم، اسد ملتانی، کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے طلوعِ اسلام کو اپنے افکار و خیالات کا ذریعۂ نشر بنایا۔ یوں تو طلوعِ اسلام کی بزمِ قلم میں دو حکیم اور ایک ڈاکٹر نظر آتے ہیں، لیکن اپنے فن کی بات صرف ڈاکٹر عبدالمجید صاحب لے کی۔ بزمِ طلوعِ اسلام میں ہومیوپیتھک طریقِ علاج کی بحث اور بھی فروز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کے مضمون سے متعلق اوراقِ گذشتہ میں مختصراً لکھا گیا تھا، اسلام روح و بدن دونوں کا نظام ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک بدن سے متعلق مباحث بے جوڑ نہیں ہو سکتے۔ اسد صاحب کے اشعار طلوعِ اسلام کی ہر اشاعت کی زینت رہے۔ یوں بھی طلوعِ اسلام اور اسد صاحب کا رشتہ دیرینہ اور ناقابلِ شکست ہے۔

ہم ان کرم فرماؤں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے طلوعِ اسلام کے پیش کردہ خیالات کو صحیح سمجھ کر اوروں تک پہنچایا، اور ان کا بھی جنہوں نے ان سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اپنے اختلافات کا ہم پر اظہار کیا۔ فکر و عمل کی قوتیں اس تنقید و تائید سے ابھرتی ہیں۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ طلوعِ اسلام اور قارئین کے اس تعاون میں تناصر میں اور بھی استواری آئے گی۔

سال گذشتہ میں اگر طلوعِ اسلام نے فی الواقعہ کوئی قابلِ قدر کام کیا ہے تو وہ محض اس مبدأ فیض کی کرم گستری ہے جو اگر چاہے تو ایک خشک لکڑی سے عصائے کلیمی کا کام لے لے۔ اور اگر ہم اپنے فرائض کی ادائیگی میں قاصر رہے ہیں تو اس کی تمام ذمہ داری ہمارے سر ہے، جس کے لئے ہم جھکی ہوئی نگاہوں اور پھیلائے ہوئے دامن سے اس ذاتِ صمدیت کی عتبۂ عالیہ پر حاضر ہوتے ہیں کہ وہ ہماری کمزوریوں کو اپنی نصرت و رفاقت کی قوتوں سے دور کر دے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ آئندہ ہم اس کے پیغامِ ازلی کو عام کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ یہی طلوعِ اسلام کی زندگی کا منتہیٰ ہے۔

سنہ ۱۹۴۸ء

اقراء کتابک

آج سے ایک سال پیشتر، آغازِ سفر کرتے ہوئے، طلوعِ اسلام میں ان واقعات و حوادث کا سرسری جائزہ لیا گیا تھا جو برصغیر ہند کی تقسیم پر منتج ہوئے۔ مسلمانانِ ہند کو اپنے ملی مقصد کے حصول کے ساتھ ہی جن غیر متوقع اور صبر آزما حالات کا سامنا کرنا پڑا، ان کا اجمالی تذکرہ بھی اولیں جائزے میں آ چکا ہے۔

استقلالِ پاکستان تک مسلمانوں کے سینے اس احساس سے تنے ہوئے تھے کہ ان کے مقصد کی صداقت کے سامنے بالآخر ملوکیت کی سحر طرازیاں اور سرمایہ داری کی فسوں کاریاں عاجز آ گئیں۔ مسلمانوں نے ۱۹۴۰ء میں جو سیاسی موقف اپنے لئے متعین کیا تھا، آٹھ سال کے عرصہ کی "نزاعی لیبار" کے بعد وہی موقف برصغیر کے سیاسی تعطل کا واحد حل تسلیم کیا گیا۔ انگریز اور ہندو کی سیاست، جو سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک نادر مرقع بن چکی تھی، سادہ اور بے پیچ مسلم سیاست کے آگے اعترافِ شکست پر مجبور ہو گئی۔ جس ناگزیر صورت کو ٹالا جاتا رہا وہ آخر الامر متشکل ہو کے رہی۔ اس حد تک مسلمانوں کو ایک عظیم الشان کامیابی ہوئی۔ جن نامساعد حالات میں اور جس ناگہانی سے یہ کامیابی حاصل ہوئی اس سے اس کی عظمت اور بڑھ جاتی ہے۔

مسائلِ مہمہ کا ہجوم

جس حد تک صاف ستھری سیاسی جنگ کا تعلق رہا، ہندو اور انگریز حریفوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ تجویزِ پاکستان کو ناقابلِ عمل بتانے والے انگریز سیاسیین کے ہاتھوں اس کا تار و پود تیار رہا، اور بھارت کی تقسیم کو مہاپاپ کہنے والے ہندوؤں نے اس کی تکمیل پر رضامندی کا اظہار کیا۔ لیکن جب اس باہمی رضامندی سے طے شدہ خاکے میں رنگِ عمل بھرنے کا وقت آیا، مسلمان اپنی روایتی شرافتِ نفس کی بدولت انگلستان و ہندوستان کے مشترک الاغراض تنبیوں کی پس پردہ سودا بازیوں کے ہاتھوں مات کھا گئے۔ سفید و سیاہ کے اس بظاہر اچھوتے اشتراک نے روزِ اول ہی مسلمانوں کے لئے اس قدر مصائب پیدا کر دیئے کہ انہیں کچھ وقت ایسا محسوس ہوتا رہا کہ انہوں نے پاکستان کو آزاد کرا کر ایک بہت بڑی مصیبت مول لے لی ہے۔ پنجاب و بنگال کی حد بندی، کشمیر کا الحاق، ہند مسلمانوں کا منظم قتلِ عام، مہاجرین کے لٹے ہوئے قافلوں کی غیر مختتم آمد، ہندوستانی فرعونوں کی دھمکیاں، مشتبہ کے علم برداروں کی بدعہدیاں، غرض مسائلِ مہمہ کا ایک سیلِ بے پناہ تھا جو پاکستان و ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے دو صدیوں کی محکومی سے نکلتے ہی اُمنڈ آیا۔

بارہ ماہ پیشتر، جب ہم نے مابعد تقسیم کے کوائف کا جائزہ لیا تھا، ہم پاکستان کے "علاقائی تشخص" اور ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے طبعی قتل عام کے پہلے صدمے سے سنبھل چکے تھے۔ ہندی مسلمانوں کے ستم بردہ کاروان، جو شروع کے چند ماہ میں افراتفری کے عالم میں اپنے طور پر پناہ کی تلاش میں پاکستان آنا شروع ہوئے تھے، اب دونوں حکومتوں کے متفقہ پروگرام کے مطابق باضابطہ طور پر لائے جانے لگے تھے۔ بقیۃ السیف مسلمانوں کا اکا دکا قتل اور تخویف و ترہیب کا سلسلہ جاری تھا۔ مختلف مشترک مسائل کے متعلق پاکستان و ہندوستان میں کئی ایک کانفرنسیں ہوئیں اور ان میں متعدد فیصلے کئے گئے۔ لیکن فراعنۂ ہندوستان نے ایک شکست خوردہ انسان کی طرح بوکھلاہٹ کا دلچسپ مظاہرہ کرتے ہوئے ہر معاہدہ کی شرائط کو توڑا۔ بھارت ماتا کی تقسیم کے بعد ایک اور صدمہ انہیں بے قرار کر رہا تھا۔

کشمیر اقوام متحدہ میں

تاج برطانیہ کے آخری نمائندہ ہند۔ ماؤنٹ بیٹن۔ کی آخری کرم فرمائی سے ریڈکلف نے سراسر غیر فطری حد بندی سے ہندوستان کے لئے الحاق کشمیر کی راہ ہموار کر دی تھی۔ ڈوگرہ حکمران کے ذاتی فیصلے نے کشمیر کو، جو جغرافیائی، معاشی اور ثقافتی اعتبار سے صرف پاکستان کا حصہ ہو سکتا تھا، پٹیل اور نہرو کی گود میں ڈال دیا۔ اس غیر فطری الحاق کے خلاف کشمیر و جموں کے بے زبان باشندوں کا خاموش احتجاج اب کے توپ و تفنگ کا واسطہ ڈھونڈنے لگا۔ دبی ہوئی مخلوق نے اپنی آزادی کا اعلان کر کے استبداد کا تختہ الٹ دینے کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ مہاراجہ کے زوال پذیر اقتدار کو سہارا دینے کے لئے ہندوستانی فوجیں، ہلاکت آفرینی و تباہ کاری کی تمام قوتوں سے مسلح ہو کر اس عزم کے ساتھ کشمیر پہنچیں کہ آزاد کشمیر کے مجاہدین کو چند روز کے اندر ریاست کی حدود سے نکال دیا جائے گا۔ تین چار ماہ کی معرکہ آرائی نے ہندوستان کے سرداران جنگ کو اچھی طرح محسوس کرا دیا کہ کشمیر کے چالیس لاکھ بندگان خدا کے ولولۂ آزادی کو توپ و تفنگ سے نہیں کچلا جا سکتا۔ ہندوستان کو کشمیر میں خلاف توقع ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا کہ جس کے لئے وہ تیار نہ تھا۔

ہندوستان نے مابعد تقسیم جو حرکات کیں ان سے اس کی ساکھ بیرونی دنیا میں کافی خراب ہو چکی تھی۔ پاکستان کے ساتھ معاہدہ کر چکنے کے بعد اس کے فوجی ذخائر اور پچپن کروڑ روپیہ کی ادائیگی سے انکار نے اس کے وقار کو اور زیادہ صدمہ پہنچایا۔ یہ حالات تھے جن میں ہندوستان، مدعی کی حیثیت سے گزشتہ سال کے شروع میں اقوام عالم کے ادارہ میں پیش ہوا۔ کشمیر کے سلسلہ میں اسے پاکستان کے خلاف چند مفروضہ شکایات تھیں۔ انہیں متحدہ اقوام کی مجلس تحفظ میں پیش کرتے ہوئے اس نے پاکستان کو یہ دھمکی دی کہ اگر پاکستان نے ان مزعومہ شکایات کو دور نہ کیا تو ہندوستان، پاکستان کے اندر آزاد کشمیر کے مراکز پر بمباری کرنے میں حق بجانب ہوگا۔ پاکستان نے مجلس تحفظ میں یہ پوزیشن اختیار کی کہ تنہا مسئلہ کشمیر پر بحث اس وقت تک بے کار ہے جب تک ان دیگر مسائل کو بھی زیر بحث نہ لایا جائے جو دونوں ملکوں میں وجہ نزاع بنے ہوئے ہیں۔ اور کشمیر جن کا ایک گوشہ

ہے۔ یہ دیگر مسائل جوناگڑھ، مسلمانوں کے قتلِ عام اور پاکستان کے فوجی ذخائر اور سرمایہ کی ادائیگی سے انکار سے متعلق تھے۔ ہندوستان کے چراغ پا ہونے کے باوجود مجلسِ تحفظ نے ان مسائل کو زیرِ بحث مسائل کی فہرست میں شامل کر ہی لیا، اور یہ سارا مقدمہ "ہندی پاکستانی تنازع" کہلایا۔

گاندھی کا برت

بین الاقوامی ساکھ کو بحال کرنے کے لئے مہاتما گاندھی نے اپنا پرانا حربہ ایک بار پھر — اور اب کے آخری بار — استعمال کیا۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۴۸ء کو انہوں نے برت رکھنے کا اعلان کیا، اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ

> مختلف قوموں میں جو مؤدت، میں دیکھنا چاہتا ہوں وہ مفقود ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستان کا وقار کم ہوتا جا رہا ہے اور ایشیا پر اس کی سیادت ختم ہوتی جا رہی ہے۔

اس واضح اعتراف کے بعد، ۱۵ر جنوری کو (یعنی برت کے تیسرے روز) انہوں نے اعلان کیا کہ

> میں نے برت صرف تزکیۂ نفس کے لئے رکھا ہے۔ تنازعۂ کشمیر اور اقوامِ متحدہ کی مجلسِ تحفظ کے اجلاس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

گاندھی جی کے ان متضاد بیانات کے باوجود، مجلسِ تحفظ میں اس برت کی اشتہاری افادیت سے پورا کام لیا گیا۔ پاکستان اور دیگر اقوامِ عالم کے جواب میں ہندوستان کے پاس اپنی نیک نیتی کی ایک ہی دلیل تھی اور وہ مہاتما گاندھی کا برت تھا جو اُن کے ایک اعلان کے مطابق "شیطان کو دلوں سے نکال کر اس کی جگہ خدا کی حکومت قائم کرنے کے لئے" رکھا جا رہا تھا۔ گاندھی جی کے ان اعلانات کی روشنی میں ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کا یہ برت اُن کی جانِ عزیز لے کر رہے گا، کیونکہ ہندوستان کے برسرِاقتدار طبقہ اور ہندو عوام کے تیور اس فضا کی تخلیق کے لئے ممد ہو سکتے تھے، جسے گاندھی جی نے اپنا منتہائے نظر بنا رکھا تھا۔ گاندھی جی کی جان بچانے کے لئے پچپن کروڑ کی واجب الادا رقم پاکستان کو دیدینے کا اعلان کر دیا گیا۔

مہاتما کے اس برت سے یوں کام لیا گیا۔ یہ برت بتلائے ہوئے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا اس کا اندازہ اس چیز سے ہو سکتا ہے کہ برت کے دوران میں الٰہ آباد، بمبئی، چاندوسی، نگینہ اور بعض دیگر مقامات پر مسلمانوں کے جان و مال ہندو غنڈہ گردی کا شکار بنے رہے۔ ہندوؤں کے دلوں سے "شیطان نکلنے" کا مظاہرہ برت کے دوسرے روز ہی ہو گیا جبکہ انہوں نے برلا ہاؤس کے سامنے مظاہرہ کرتے ہوئے "گاندھی کو مر جانے دو" کے نعرے لگائے۔ بہرحال اصل مقصد پیدا ہو چکا تھا، اب "تزکیۂ نفس" کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ چنانچہ چھ روز کے بعد برت توڑ دیا گیا۔

قتلِ گاندھی

اس کے بعد ہندوستان میں وہ المناک حادثہ رونما ہوا جس نے ہندوستان و پاکستان ہی نہیں ساری مہذب دنیا کو لرزا دیا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے مسلمانوں کے خاتمہ کی مہم وہاں کی منظم فسطائی ہندو جماعت راشٹریہ سیوک سنگھ کے ہاتھوں سر انجام دی جا رہی تھی۔

اس مقدس مشن میں سنگھ کو ہندو حکومت اور اس کے ارکان کی پوری سرپرستی حاصل تھی کیونکہ سنگھ کا نشانہ مسلمان تھے۔ حکومت ہند کو یہ احساس ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء تک نہ ہو سکا کہ جس بگڑے بچے کی پرورش وہ بڑی اطمینان سے کر رہی ہے وہ دوسروں کے لئے سامان اذیت فراہم کر رہا ہے، وہ اپنے ابا کی ڈاڑھی نوچنے میں بھی باک نہیں سمجھے گا۔ سنگھ کے عزائم اور ان کے کارنامے اس حد تک آشکارا ہو چکے تھے کہ ان کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ سنگھ کی بنیاد ہی نفرت و تشدد پر رکھی گئی تھی۔ مسلمانوں کو وہ بہرصورت غیر ملکی اور غاصب سمجھتے تھے۔ ان کے استیصال کیلئے وہ کسی قسم کی کمزوری یا مصلحت شناسی کے روادار نہیں تھے۔ چنانچہ مہاتما گاندھی کے برت کے سلسلہ میں ہندو مہا سبھا کی طرف سے شدید احتجاج کیا گیا کہ مسلمانوں کے "پاس خاطر" کا کیوں سامان کیا جا رہا ہے۔ لیکن گاندھی جی نے سیوک سنگھ کو بے گناہی کا سرٹیفکیٹ دے کر اعلان کیا کہ مجھے سنگھ کے ذمہ دار راہنماؤں نے یقین دلایا ہے کہ وہ تشدد کے حامی نہیں بلکہ ان کا مقصد صرف خدمت خلق ہے۔ اس اعلان کے جلد بعد ایک ہندو مدن لال نے گاندھی جی پر بم پھینکا۔ اتفاق سے وہ بچ نکلے لیکن اس سے یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ ہندو کے دماغ کا خط لنگر کیا ہے۔ آخر ۳۰ جنوری کی شام کو ایک اور ہندو نتھو رام گوڈسے نے اپنے مہاتما اور محسن اعظم کو گولی کا نشانہ بنایا۔ گاندھی جی کے ایک طرف پٹیل تھا جو سیوک سنگھ کا سرخیل ہونے کی حیثیت سے بے پناہ اور خطرناک طاقت بنتا جا رہا تھا۔ اس کی حکمت عملی سے ہندوستان اقوام عالم کی صف میں بدنام ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقار کو نہرو کے ہاتھوں بحال و برقرار کرایا جا سکتا تھا۔ نہرو گاندھی جی کا منہ بولا "جائز وارث" بھی تھا۔ لیکن اس کی قیادت پٹیل کی بڑھتی قوت کے سامنے ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔ گاندھی جی نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور نہرو کی قیادت کو بحال کرنے کے ارادے سے برت رکھا۔ چنانچہ گاندھی جی کو یہ کہنا پڑا کہ یہ برت پٹیل کے خلاف نہیں۔ آخر کار پٹیل نے اعتراف شکست کیا اور اس نے گاندھی جی کے سامنے سپر ڈال دی۔ پٹیل نے سپر تو ڈال دی لیکن وہ فراموش نہ کر سکا کہ گاندھی جی نے غیر معمولی دباؤ سے اس کی سیاست کا دھارا روکا ہے۔ پٹیل نے سپر ڈال کر گاندھی جی کو برت سے تو مرنے نہ دیا لیکن زندگی کی یہ مہلت گاندھی جی کے لئے بالکل قلیل ثابت ہوئی۔ برت کے بجائے سیوک سنگھ نے وہ کام کر دیا اور اس انداز سے کہ بظاہر ان کے سردار پر انگشت نمائی کی بھی گنجائش نہ رہی۔

قتل گاندھی کا انتقام مسلمانوں سے

مہاتما گاندھی قتل ہو گئے۔ لیکن اس سے ہندوستان کی فضا میں وہ غیر معمولی ارتعاش نہ پیدا ہوا۔ جس کی توقع ایک بیرونی متعلم سیاست کر سکتا تھا۔ بعض جگہ ہندوؤں نے اس الم ناک قتل کی "خوشی" میں "مٹھائی" تقسیم کی۔ خود گاندھی کی "روحانی اولاد" جو اپنے روحانی باپ کے صدقے اب سریر آرائے سلطنت ہو چکی تھی، رسمی آنسو بہانے سے زیادہ مرتعش نہ ہوئی۔ اس امر میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ سابقہ اعمال سیاہ کی طرح اس فعل قبیح و مذموم کی ذمہ دار بھی راشٹریہ سیوک سنگھ اور اس کی دمساز ہندو مہا سبھا ہے لیکن اُن کے خلاف کارروائی کیا

کی گئی؟ ہندو مہا سبھا نے محض مصلحت کے پیش نظر خود اعلان کر دیا کہ "کچھ عرصہ تک" اسے سیاسیات سے واسطہ نہیں رہیگا بلکہ اس کی سرگرمیاں ہندو قوم کی صرف ثقافتی ترفیع تک محدود رہیں گی۔ اتنی سی بات پر حکومت ہندوستان نے اسے معاف کر دیا۔ یہ معافی ہندو مہا سبھا کو اس حال میں ملی کہ پنڈت نہرو مہا سبھا کے متعلق یہ رائے رکھتے تھے۔

> گاندھی جی کا قتل مہا سبھا کا چیلنج تھا۔ وہ اس طرح تشدد سے حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لینے کا خواب دیکھ رہی تھی ۔۔۔۔ حکومت نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ دہشت پسندی کو بالکل برداشت نہیں کرے گی۔ (تقریر وارد ہا گنج۔ ۳۰ مارچ ۱۹۴۹ء)

سیوک سنگھ کو کاغذی طور پر خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ . . . .

ہنگامی طور پر کچھ گرفتاریاں بھی کی گئیں لیکن جس طریق پر یہ گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں اس سے معلوم ہوتا تھا کہ حکومت ہندوستان کا مقصود اس خطرناک تنظیم کا استیصال نہیں بلکہ مخالفین کا منہ بند کرنا ہے۔ خود حکومت کے ذمہ دار ارکان کی سرپرستی بلکہ عملی امداد سے ترقی پانے والی جماعت حکومت کے زیر عتاب کیسے آسکتی تھی؟ ہاں گاندھی جی کے قتل کا ایک فائدہ ہندوؤں کو یہ ہوا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی رہی سہی قوت کو ختم کر دینے کا ایک بہانہ ان کے ہاتھ آ گیا۔ مسلمانوں کی ملی وحدت، ان کی زبان و ثقافت پر مکمل یلغار کرنے کے بعد اب انہوں نے مسلم فرقہ پرستی پر قانون کی طاقت سے ہاتھ ڈالا۔ حکومت ہندوستان کے خیال میں مہاتما گاندھی کے قتل کے ذمہ دار ہندو فسطائی نہیں بلکہ "فرقہ پرستی" تھی۔ لہذا راشٹریہ سیوک سنگھ پر پابندی لگانے کے ساتھ ہی مسلم لیگ نیشنل گارڈ اور خاکسار جماعت کو بھی خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ خاکسار تقسیم ہند سے پیشتر ہی اپنے ہاتھوں اور مسلم لیگ

. . . .

. . . نیشنل گارڈ تقسیم کے ساتھ ہی عملی طور پر ختم ہو چکے تھے۔ ان میں اتنی جرأت کہاں باقی رہ گئی تھی کہ وہ ہندوستان میں اپنی رضاکارانہ خدمات کا سلسلہ جاری رکھیں۔ وہاں تو انہیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ لیکن حکومت ہند کو اس قانونی گنجائش سے مسلم لیگ کے سابقہ قائدین و کارکنان سے انتقام لینے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کو خوب دہشت زدہ کیا گیا۔ سیوک سنگھ کے ارکان کو آہستہ آہستہ رہا کر دیا گیا، لیکن مسلمانوں کی تخویف جاری رہی۔ ممتاز مسلمانوں سے بالجبر کہلایا گیا کہ انہوں نے دور گزشتہ میں لیگ کا ساتھ دے کر غلطی کی تھی۔

مسلمانان ہندوستان کی آزادی پر کس قسم کی پابندیاں عائد ہوئیں اور وہ کس قسم کے ظلم و استبداد کا نشانہ بنے اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ مارچ میں یو۔ پی کے مسلم لیگی ایم، ایل اے، عبد الباقی صاحب کی گرفتاری سے متعلق بیان دیتے ہوئے صوبہ کے وزیر داخلہ نے اسمبلی میں کہا:۔

> یہ عبد الباقی کا ہی گھر تھا جہاں اعظم گڑھ میں بیشتر مسلمان پاکستان ریڈیو سننے کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔

جیسا یہ ملک پاکستان جس سے دوستی کا دم ہندوستان ہر وقت بھرتا رہتا ہے اس کا پرچہ پڑھنا بھی ہندوستان میں جرم ہے؛ پاکستان کا جاسوس کہہ کر کسی مسلمان کو گرفتار کیا جاسکتا ہے اور بلا ثبوت کسی مسلمان کو ملازمت سے سبکدوش کیا جاسکتا ہے۔ ہندو مہاسبھا جذبات کے ہنگامی دور کے بعد پھر سرگرم عمل ہوگئی، لیکن مسلم لیگ کو پھر ابھرنے نہ دیا گیا۔

مسلمانانِ ہندوستان کی شکست خوردگی

ہندوستان کی مجلس دستور ساز اور صوبجات متحدہ کی مجلس مقننہ میں لیگ پارٹیاں ختم کر دی گئیں۔ اس کے بعد صوبجات متحدہ، بہار، صوبجات متوسط، آسام اور مغربی بنگال میں لیگ کے سرکردہ اکابرین یہ اعلانات کرنے پر مجبور ہوگئے کہ ہندوستان میں اب لیگ کو باقی نہیں رکھنا چاہیئے۔ خود وہ لوگ بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے جن کا وظیفۂ حیات ہی کانگرس دوستی رہا۔ "قوم پرست" علماء کی طرف سے گاندھی جی کی وفات کے بعد "اسلامی شریعت" کے مطابق ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا۔ نیز فیصلہ کیا گیا کہ گاندھی جی کی راکھ کا جلوس نکال کر اسے جامع مسجد دہلی کے قریب دفنایا جائے اور اس پر دس لاکھ روپے کے خرچ سے ایک نہایت شاندار مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُن مسلمانوں کا کیا حال ہوگا جو حمایت پاکستان کے سبب خاص طور پر ہندو کی آنکھ کا کانٹا بن چکے تھے۔

وسط دسمبر ۱۹۴۷ء میں، آل انڈیا مسلم لیگ، پاکستان مسلم لیگ اور ہندوستان مسلم لیگ میں تقسیم کر دی گئی تھی۔ فروری ۱۹۴۸ء میں کراچی میں، پاکستان مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس ہوا جس میں اس اہم فیصلہ کے ساتھ کہ ارکان حکومت، لیگ کے عہدیدار نہیں بن سکیں گے، لیگ کی تنظیم نو کا لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ نئے انتخابات تک لیگ کو معطل کر دیا گیا اور چودھری خلیق الزمان کو، جو ہندوستان مجلس دستور ساز کی لیگ پارٹی اور مسلمانان صوبجات متحدہ کی قیادت کو ترک کرکے مستقل طور پر پاکستان آچکے تھے، پاکستان بھر میں تنظیم لیگ کے لئے مختار کُل مقرر کر دیا گیا۔

تقسیم لیگ کرتے ہوئے ہندوستان مسلم لیگ کے محرک کے فرائض، مدراس کے لیگی راہنما مسٹر محمد اسمٰعیل کے سپرد کئے گئے تھے۔ ۱۰ مارچ کو انہوں نے ہندوستان لیگ کی کونسل کا اجلاس مدراس میں طلب کیا۔ ابھی بتایا جاچکا ہے کہ ۱۰ مارچ تک ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کس قسم کے حالات پیدا کئے جاچکے تھے۔ حسب توقع اس اجلاس میں ۴۰۴ میں سے صرف تیس ارکان نے شرکت کی۔ شرکاء کی تعداد کے لحاظ سے یہ ایک مایوس کن اجتماع تھا لیکن ہندوستان کی عام فضا کے مطابق اجلاس مدراس کی تحریک ہی ایک بہت بڑا جرأت مندانہ اقدام تھا۔ تیس مسلمانوں کا مسلم لیگ کی صورت میں اجتماع اور مسلمانان ہندوستان کی علیحدہ تنظیم برقرار رکھنے کا اعلان ایک ایسا کارنامہ تھا جس کے لئے انہیں مستحق مبارکباد سمجھنا چاہیئے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے یہ مجبوریاں تھیں کہ جمعیت العلماء کو بھی اپنی سیاسی سرگرمیاں

ترک کردینی پڑیں۔ ادھر پاکستان میں یہ آزادیاں کہ سرحد کے عبدالغفار خاں نے کھلم کھلا پختونستان کا پراپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا۔ انہوں نے پاکستان کو پریشان کرنے کیلئے اپنی قوتیں ایک نئی جماعت "آل پاکستان پیپلز پارٹی" کی صورت میں مجتمع کر لیں۔ اس جماعت میں وہ تمام غیر متجانس عناصر شریک کئے گئے جو اپنی سابقہ بدعنوانیوں کے باعث اپنا مستقبل خراب کر چکے تھے اس کے ساتھ ہی غفار خاں کے طائفہ سرحد جماعت "سرخ پوشان" نے اپنی سرگرمیاں اس حد تک تیز کر لیں کہ وہ پاکستان پر حملہ کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ ان تمام کارروائیوں کے پیچھے پاکستان پار کا "دستِ غیب" کارفرما تھا۔ چنانچہ بعد میں جب ان کو گرفتار کیا گیا تو ہندوستان کے نیم سرکاری اخبار "ہندوستان ٹائمز" نے پاکستان کو دھمکی دی کہ ان حرکات سے وہ ہندوستان کی دوستی کھو بیٹھے گا۔

اقوام متحدہ میں ہندوستان کی رسوائی اور سازش

اب ذرا اپنی نگاہ لیک سکسس کے منظر پر لائیے جہاں ہندوستان کا مقدمۂ کشمیر اقوام متحدہ کی مجلس تحفظ میں زیر بحث تھا۔ ہندوستان نے اپنے فراہم کردہ مفروضہ حقائق و شواہد کے زور سے پاکستان کو مجرم ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ کشمیر کے متعلق آخری اور قاطع دلیل۔ شیخ عبداللہ۔ کو بھی پیش کیا گیا لیکن پاکستان نے جس قابلیت اور صفائی سے اپنا معاملہ پیش کیا اس سے دنیا کو اصل حقیقت دیکھنے میں دقت نہ رہی۔ فروری میں مجلس تحفظ کے ارکان نے پاکستان کے نقطۂ نظر کو صحیح تسلیم کیا۔ اس پر ہندوستانی وفد غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا مجلس کا اجلاس ملتوی کرانے کے بعد، واپس آگیا۔ اس کے بعد جو کچھ اس سلسلہ میں ہوا اس سے ایک دفعہ پھر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ جس حد تک صاف ستھری سیاسی جنگ کا تعلق ہوتا ہے مسلمان حریفوں کو پچھاڑ دیتا ہے لیکن عملی کارروائیوں، خفیہ ریشہ دوانیوں، پیچ در پیچ سازشوں اور سودا بازیوں میں وہ مات کھا جاتا ہے۔ فروری تک مسئلہ کشمیر کے متعلق مجلس تحفظ کا جو نقطۂ نظر رہا وہ اس کے بعد یکسر بدل گیا۔ جس نقطۂ نظر سے روٹھ کر ہندوستانی وفد گھر لوٹ آیا تھا، وہ کچھ وقت کے بعد سراسر ان کے حق میں ہو جاتا ہے اور پاکستان انگشت بدنداں ہو کر دیکھتا ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔

قضیۂ فلسطین

مجلس تحفظ کو کشمیر کے علاوہ ایک اور مسئلہ بھی پریشان کر رہا تھا۔ یہ مسئلہ فلسطین کا تھا۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی تقسیم فلسطین کی تجویز منظور کر چکی تھی۔ عرب اس کو متفقہ طور پر مسترد کر چکے تھے۔ برطانیہ خود پیدا کردہ مشکل سے بڑے بھونڈے طریق پر نکلنے کا اعلان کر چکا تھا۔ اس نے ۱۵ مئی اختتام انتداب کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔ فلسطین کو جہنم زار بنا چکنے کے بعد اب وہ اسے قیام امن کی ذمہ داری سے پہلو تہی کر کے اسے خالی کر دینے کی تیاری کر رہا تھا۔ ۱۷ فروری کو عرب لیگ کے جنرل سیکرٹری عزام پاشا نے اعلان کیا کہ اگر تقسیم قوت کے بل بوتے پر مسلط کرنے کی کوشش

فلسطین کی جنگ و جوش جنگ محاذ پر جس عمدگی سے پاکستان نے لڑی عرب ممالک پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ بلکہ عرب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اس خوش اسلوبی سے وہ خود بھی اپنا مقدمہ پیش نہیں کر سکے۔ اس سے عرب ممالک اور باقی اسلامی دنیا میں پاکستان کو ایک نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔ جس سے آئندہ روابط باہمی میں بہت مدد ملی۔

تجویز تقسیم کے سلسلہ میں ۱۹ مارچ کو ایک اہم واقعہ ہوا۔ امریکہ نے اب تک یہود نوازی کا اس حد تک ثبوت دیا تھا کہ عدل و انصاف کے تمام تقاضے بالائے طاق رکھتے ہوئے فلسطین کی آبادی کے حقوق کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ جب تقسیم کی تجویز جنرل اسمبلی میں پیش ہوئی تو عام قیاس یہی تھا کہ اس کے حق میں مطلوبہ دو تہائی ووٹ نہیں آ سکیں گے۔ لیکن امریکہ نے درپردہ کارروائیوں سے، مختلف حیلوں بہانوں سے مطلوبہ اکثریت حاصل کر لی۔ یہ تمام تگ و تاز اس مقصد کے پیش نظر تھی کہ آنے والے امریکی صدارتی انتخاب میں ٹرومین کے لئے یہودی ووٹ یقینی ہو سکیں۔ عربوں نے تقسیم پر عمل درآمد کرنے کے خلاف قوت استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی عرب ممالک نے تیل کی ان مراعات کو بھی واپس لینے کا فیصلہ کیا جو ان کے علاقوں میں امریکہ کو حاصل تھیں۔ عربوں کے اس اقدام کی زد امریکہ کی نازک رگ پر پڑتی تھی۔ ان مشکل حالات اور یورپی ممالک میں اشتمالیت کے بڑھتے ہوئے خطرات سے مجبور ہو کر امریکہ نے بالآخر ۱۹ مارچ کو تقسیم کی تجویز سے دستکشی کا اعلان کر دیا اور اس کی بجائے فلسطین کو تولیت میں دینے کی تجویز پیش کی۔ امریکہ کے اس اعلان مجبوری سے اس کے اپنے وقار کے علاوہ ادارۂ اقوام متحدہ کے وقار کو بھی سخت صدمہ پہنچا۔

ہندستان کو دھرا

یہ ذکر ہو چکا ہے کہ مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لئے دہشت زدگی اور سخت گیری کا ایک نیا دور شروع ہو گیا تھا۔ فرقہ وارانہ حمایت لیگ ہی کچھ کم جرم نہ تھا اب ان کے لئے ایک نئی مصیبت پیدا کی گئی۔ ہندوستان کی سینکڑوں دیسی ریاستوں کو بالجبر ہندوستانی صوبوں یا نئی جمہوری ریاستوں میں ختم کرنے کے بعد حیدرآباد پر تمام توجہ مجتمع کی گئی تاکہ یہ کھٹکتا ہوا کانٹا بھی نکل جائے۔ مختلف طریقوں سے اس پر دباؤ ڈالا گیا۔ سرحدوں پر گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اقتصادی ناکہ بندی کر کے ریاست کے لئے گوناگوں مشکلات پیدا کی گئیں۔ لیکن حیدرآباد کی ریاست نے سر اطاعت خم نہ کیا۔ ہندوستان کی ان کارروائیوں سے حیدرآباد کے باشندوں کو تو مصائب کا سامنا کرنا ہی پڑا لیکن ہندوستان کے مسلمان بھی ان کی دستبرد سے نہ بچ سکے۔ "حیدرآباد کی حمایت" ایک نیا جرم تھا جو ان سے منسوب کر کے انہیں مزید پریشان کیا گیا۔ یہ تو تھی قانونی کارروائی جو حکومت کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ غیر قانونی کارروائی بھی جاری رہی جو ہندو فسطائیوں کے سپرد تھی۔ ان کی کارکا

کارروائیاں تو کسی وقت بھی نہیں رکی تھیں۔ ۲۵ مارچ کو انہوں نے ایک بار پھر بڑے پیمانہ پر اپنی قوت کا مظاہرہ کیا۔ اب کے احاطہ بمبئی کے ایک شہر گودھرا کو مشقِ ناز کے لئے منتخب کیا گیا۔ اس تاریخ تک اس بدقسمت شہر میں دس ہزار مسلمان بستے تھے۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندہ کی اطلاع کے مطابق پچیس ہزار پریشان روزگار مہاجر اپنی جانوں کو سلامت لے کر باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ باقی پانچ ہزار کا کیا حشر ہوا؟ اس کا جواب زبانِ خنجر تو چپ ہی رہے گی۔ "شاید آستین کا لہو" اس معمہ کو حل کر سکے لیکن اس کے لئے "روزِ محشر" تک انتظار کرنا پڑے گا۔ احمد آباد ضلع کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری اور دوسرے کانگریسی کارکنوں نے گودھرا سے واپسی پر بتایا کہ شہر عملی طور پر خاکستر ہو چکا ہے۔ انہوں نے آگ کے شعلے چودہ میل کے فاصلے سے دیکھے۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کے محولہ نمائندہ کو ایک برٹش سپاہی نے جو گذشتہ جنگِ عظیم میں اٹلی میں ہولناک آتشیں تباہ کاری کے مناظر دیکھ چکا تھا، اپنے تاثرات بتاتے ہوئے کہا کہ اس نے اس قسم کی تباہ کاری دشمن کے بمباروں سے بھی نہیں دیکھی۔ لیکن حکومت بمبئی کو اطمینان تھا کہ صرف چھ مسلمان مارے گئے ہیں اور سولہ یا سترہ زخمی ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ قتل کا جو کچھ چرچا ہے وہ شورِ بے معنی ہے۔

مسلمانانِ ہندوستان کا ثقافتی قتل

حکومت مضطرب بھی کیوں ہوتی؟ "ثقافتی قتل" اس نے اپنے ذمے رکھا تھا اور طبعی قتل، قوم کر رہی تھی۔ ایک ہی مہم کے دو محاذ تھے۔ گودھرا کے ساتھ ہی حکومت نے ہندوستان سے مسلمانوں کا جداگانہ ملی تشخص مٹانے کے لئے ایک اور اقدام کیا۔ ہندوستانی پارلیمان میں ایک قرارداد کے ذریعے جداگانہ جماعتوں کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ اس قرارداد کا مقصد مسٹر آئنگر نے یہ بتایا کہ ہر ہندوستانی کو اول و آخر ہندوستانی ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے اس کو صاف لفظوں میں یوں کہہ دیا کہ انگریز کے جانے کے بعد اب ہر اقلیت کو اپنی حفاظت کے لئے اکثریت ہی کی پناہ ڈھونڈنی پڑے گی۔ پارلیمان کے باہر اچاریہ کرپلانی نے ایک تقریر میں مسلمانوں کا یوں امتحان لیا۔

> ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ جوق در جوق حیدر آباد جائیں اور اس ریاست میں اپنے ہم مذہب مسلمانوں کی دہشت انگیز کارروائیوں کا خاتمہ کریں۔ ورنہ ان کا دعویٰ وفاشعاری بالکل بے معنی سمجھا جائے گا۔

اپریل کے نصفِ اول میں یہ امتحان ہندو اکابر نے لیا اور اواخر اپریل میں جمعیت العلمائے ہند نے اپنا ایک اجلاس بمبئی میں کیا جس کے صدر حسین احمد مدنی نے اپنے خطبہ میں فرمایا۔

> ہندوستان کی تاریخ میں مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے دماغ سے بڑا [illegible]

حروف میں لکھے جائیں گے۔ یہ حضرات مسلمانوں کے سب سے بڑے دوست ہیں۔

(ہندوستان ٹائمز ۲۸ ستمبر ۴۹ء)

"وفاداری بشرطِ استواری" کی اس سے زیادہ روشن مثال کہیں اور بھی مل سکتی ہے؟

پاکستانیوں کے مشاغل

پاکستان میں ان دنوں بہی خواہانِ ملت کی توجہات پنجاب و سندھ کی اندرونی خلفشار پر مرکوز ہو رہی تھیں۔ پاکستان کے دونوں ممتاز صوبوں میں وزارتی کشمکش نازک اور افسوسناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ قائد اعظم نے اس موقع پر "فولادی پنجہ" کا استعمال کیا۔ سندھ کے وزیر اعظم محمد ایوب کھوڑو کو برخاست کر کے اُن کے خلاف مبینہ الزامات کی تحقیق کے لئے ایک خاص عدالت قائم کر دی گئی جو نومبر تک اپنی تحقیقات ختم کر کے اپنی رپورٹ مرتب کر رہی ہے۔

مسٹر کھوڑو کی برطرفی کے بعد سندھ اسمبلی مسلم لیگ پارٹی نے پیر الٰہی بخش صاحب کو اپنا لیڈر منتخب کیا۔ پیر الٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور کھوڑو وزارت میں وزراء تھے۔ وہ اپنے لیڈر یعنی وزیر اعظم کی دراز دستیوں کے خلاف پس پردہ لب کشائی کر چکے تھے۔ لیکن جب وزیر اعظم نے اپنا بیان دیا تو دونوں حضرات نے "سجدۂ سہو" ادا کرتے ہوئے وزیر اعظم سے متعلق جملہ اختلافات و الزامات کو یک قلم ختم کر دیا۔ اتفاق سے مسٹر کھوڑو برطرف ہو گئے اور وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داری جناب پیر کو سنبھالنی پڑی۔ پیر صاحب نے اپنے متعلق اخباری پروپیگنڈہ کے ذریعہ ایسا ماحول پیدا کیا کہ ایسا معلوم ہونے لگا کہ سندھ کے حالات اب سنور جائیں گے اور آئندہ وزارت ذاتی اغراض سے علیحدہ ہو کر ملک و صوبہ کے حقیقی تقاضوں کو پورا کرے گی۔ یہ حسنِ ظن عارضی ثابت ہوا۔ صوبہ سندھ کی روایتی ہندو پروری اور مہاجر دشمنی رنگ لائی۔ مہاجرین رنگا رنگ کے مظالم اور سختیوں کا نشانہ بننا شروع ہو گئے۔ ہندوؤں کو ناجائز اور خوشامدانہ مراعات ملنا شروع ہو گئیں۔ پیر صاحب نے اپنا خفیہ پرسنل اسسٹنٹ ایک ہندو پرسرام کو متعین کیا جو ۲۰ ستمبر کو ہندوستان بھاگتے ہوئے کراچی کے ہوائی اڈہ پر گرفتار ہو گیا۔ گرفتاری کے بعد تلاشی ہوئی، اس کے قبضہ سے حکومت کی خفیہ دستاویزات برآمد ہوئیں۔ پیر صاحب نے اضطراری بیان میں پرسرام کے تعین کو صحیح ثابت کیا اور خدا اور خدمتِ وطن کا واسطہ دے کر اپنی بریت ثابت کی۔ اس حادثہ کے کچھ ہی بعد ایک ہندو مختار کار ہندوستان بھاگ گیا اور وہ ہزاروں روپیہ کپڑا اور ضروری کاغذات ساتھ لے گیا۔ یہ شخص مہاجر زدہ علاقہ میں ری ہیبلیٹیشن کے کام پر متعین تھا۔

سندھ نمک کے اعتبار سے اہم صوبہ ہے۔ پیر صاحب کی وزارت کے زمانہ میں بے شمار نمک ناجائز طور پر ہندوستان کو برآمد ہوا۔ یہ سب کچھ پولیس کی سرگرم امداد سے نہیں تو تغافل شعاری سے ضرور ہوا۔ خود سکھر بند کی شکست سے متعلق عام قیاس یہی ہے کہ وہ حکومت کی مجرمانہ غفلت کا نتیجہ تھا۔ یہ اور بیشتر ایسے واقعات منظرِ عام پر آ چکے اور آ رہے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیر وزارت "خدا اور ملک" کے مفاد کی کس حد تک سرخرو ہے۔ مسٹر کھوڑو کی برطرفی سے اس وزارت نے کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔

مسٹر کھوڑو کا مقدمہ ہنوز زیر سماعت ہے لیکن ان کا دماغ کیا منصوبہ بندی کر رہا ہے؟ اس کا جواب ان کے اس فعل سے ملتا ہے۔ حال ہی میں صوبہ کی مسلم لیگ کے انتخابات ہوئے۔ اس کے نتیجہ میں صوبائی لیگ کی صدارت کا انتخاب بھی ہوا۔ کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی میعاد ختم ہونے لگی تو پُر اسرار طور پر اس مدت میں تین گھنٹے کا اضافہ کر دیا گیا۔ مسٹر کھوڑو نے "اچانک" اور خلاف توقع اپنے کاغذات داخل کر دیئے۔ مقابلہ ہوا تو وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔ کامیابی کے بعد انہوں نے صوبائی لیگ کی متعلقہ مجالس کی نامزدگیاں اور تقریباً حسب منشا کر کے استعفا بدیں وجہ دیدیا کہ وہ اس وقت تک باقاعدہ صدارت قبول نہیں کریں گے جب تک کہ مقدمہ سے ـــــ جیسا کہ انہیں اپنی بے گناہی کے پیش نظر توقع ہے ـــــ باعزت بری نہیں ہو جاتے۔ اس وقت سندھ مسلم لیگ ہیئت کے اعتبار سے کھوڑو مسلم لیگ ہے۔ جماعت پر قبضہ اس کا ہے جو وزارت سے برطرف کر دیا گیا ہے۔ وزارت اور جماعت ان حالات میں تعاون کا کیا مظاہرہ کریں گی؟ دیدہ باید۔

توقع کی جاتی تھی کہ امور سندھ و دیگر ریاستوں کے لئے سامان عبرت مہیا کرنے کے لئے کافی ہوں گے لیکن بدقسمتی سے یہ توقع صحیح ثابت نہ ہو سکی۔ پنجاب کے اندرونی خلفشار میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اس خلفشار سے جہاں بیچاری قوم میں بددلی پیدا ہوئی وہاں مخالفین کے لئے سرمایہ تضحیک مہیا ہو گیا۔

جب سے ممدوٹ صاحب نے مغربی پنجاب کی وزارت سنبھالی ہے آپ نے متعدد بار یہ اعلان کیا کہ وزارت میں ہجوم کار کے باعث توسیع کی جائے گی۔ نیز انہوں نے وزارت کے "شاندار کارناموں" کا بھی متعدد بار تذکرہ کیا۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں میاں افتخار الدین اور مئی ۱۹۴۸ء میں میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات ان کی وزارت سے مستعفی ہو گئے۔ باہمی بیان بازی میں معلوم ہوا کہ کسی ایک وزیر کا بھی کوئی قابل ذکر کارنامہ نہیں۔ ہر شخص شخصی استحکام اور ذاتی تعلق میں مصروف ہے۔ یہ صورت حال اسی طرح رہی۔ ان حضرات کے بجائے اور حضرات وزارت میں لے لئے گئے۔ پنجاب میں وزارت کے لئے انتخاب جوہر قابلیت نہیں، بلکہ یہ "حقیقت ہے کہ متعلقہ وزیر کے ساتھ کتنے ووٹ حاصل ہوتے ہیں"۔ نومبر میں ممدوٹ وزارت نے استعفیٰ دیدیا۔ کوئی مہینہ بھر کے اختلاف و کشمکش کے بعد شیخ کرامت علی کو علیحدہ کر کے ان کے بجائے فضل الٰہی صاحب کو وزیر مقرر کر دیا گیا۔ مرکز نے ملک نون اور ممتاز دولتانہ کو شریک وزارت کرنے کا مشورہ وزیر اعظم کو دیا۔ وزیر اعظم نے بہ لطائف الحیل اس سے پہلوتہی کی۔ مرکز نے بالآخر اپنا مشورہ واپس لے لیا اور وزیر اعظم صاحب من مانی کارروائی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ صوبائی اور ملکی مسائل کا اللہ مالک ہے۔ اپنی وزارت محفوظ ہونی چاہیئے۔ سو اس کا انتظام کر لیا گیا۔ پنجاب کی ناگفتہ بہ حالت کا تذکرہ موجودہ گورنر جنرل کو اپنے دورہ میں نومبر کے آخر راولپنڈی کی تقریر میں بھی کرنا پڑا۔

پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے حالیہ انتخابات نے صوبہ کی اس حالت کو خراب تر کر دیا ہے۔ انتخابات میں ایک طرف وزارتی پارٹی تھی جو مسلم لیگ پر قبضہ کر کے اس کے حزب اختلاف بن جانے کے اندیشے کم کرنا چاہتی تھی۔

اور دوسری طرف وہ وزارت سے نکلا ہوا گروہ تھا جو مسلم لیگ کو اپنے ہاتھ میں لے کر وزارتی گدیوں تک پہنچنا چاہتا ہے یا کم از کم اس پلیٹ فارم سے وزارتِ وقت کو پریشان کر سکتا ہے۔ انتخاب کے دوران میں کیا کیا حرکات کی گئیں ان کی تفصیل میں نہ جائیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر الذکر گروہ کامیاب ہو گیا۔ دونوں حریف گروہوں کے بیانات دیکھئے۔ دونوں میں جاذب اور دلخوش کن وعدے ہیں۔ دونوں میں عوام کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ عوامی بہبود نہ ایک کے پیشِ نظر ہے نہ دوسرے کے۔ مطمحِ نظر ذاتی تفوق ہے اور بس۔

بیشتر ازیں مشرقی پاکستان میں انتشار پسندوں نے صوبائیت کو ہوا دے کر فضا بہت کچھ مکدر کر دی تھی۔ مارچ میں قائدِ اعظم نے خود وہاں کا دورہ کیا اور مسلمانوں کو انتشار انگیز قوتوں سے خبردار کیا۔ اس دورہ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ صوبائیت نے سندھ میں بھی سر اٹھایا۔ کراچی کے دارالسلطنت پاکستان بن جانے کے بعد اسے مرکز کی تحویل میں دینے کی تجویز ہوئی تو سندھ نے اس کے خلاف براہِ راست اقدام کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ غیر سندھیوں کے خلاف نفرت کے مظاہرے کئے گئے۔ لیکن بالآخر قائدِ اعظم کے سمجھانے پر اکابرینِ سندھ اپنی خلافِ مملکت سرگرمیوں سے رک گئے اور مئی میں پاکستان پارلیمان نے یہ فیصلہ کر دیا کہ مرکزی حکومت کا دارالسلطنت کراچی ہوگا اور اس مقصد کے لئے اسے سندھ سے علیحدہ کر کے مرکز کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔

آزاد پاکستان میں پہلا یومِ اقبالؒ اور قوم کا مذاق

اندرونی تفرقہ انگیزی و جنگ زرگری کے ساتھ اپریل ۱۹۴۸ء میں پاکستان میں احسان فراموشی اور احساس کے بعد ذوقی کا بے مثل مظاہرہ کیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد سال ۱۹۴۸ء کے لئے جب سرکاری تعطیلات کی فہرست منظرِ عام پر آئی تو معلوم ہوا کہ اس فہرست میں ان غیر مسلموں کے مذہبی تہواروں کی چھٹیاں تو موجود ہیں جن کی اکثریت پاکستان کو ترک کر کے ہندوستان کی مستقل سکونت اختیار کر چکی ہے اور جو باقی ہیں انہیں پاکستان کی وفاداری میں ندوقائی[1] "اذیت ہو رہی ہے۔ لیکن ملت کے محسنِ عظیم اور مصورِ پاکستان کے بانی کے یومِ وفات کی چھٹی نہیں کی گئی۔ حکومت کی اس مجرمانہ فروگذاشت کے خلاف احتجاج کیا گیا اور ۲۰ کی شام کو ۲۱ اپریل کی تعطیل کا اعلان کرنے پر آمادہ ہو گئی[2]۔ یہ تو تھی حکومت کی فروگذاشت۔ قوم نے اقبالؒ کے ساتھ جو مذاق کیا وہ "تحسینِ ناشناس" کا ایک افسوسناک مظاہرہ تھا۔

---

[1] ہندوستانی ڈپٹی کمشنر متعینہ پاکستان مسٹر سری پرکاش نے مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کے اخلاقی منصب روحانی (Spiritual Corps) بتایا تھا۔ [2] ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ حکومت پاکستان کی طرف سے سال ۱۹۴۹ء کی چھٹیوں کی جو فہرست شائع ہوئی ہے اس میں یومِ اقبال کی تعطیل کا پھر کہیں ذکر نہیں۔ کہیے اب قوم کیا کرتی ہے؟

اقبالؒ کی یاد منانے کے لئے وسیع پیمانے پر تیاریاں کی گئیں۔ کراچی میں یہ تقریب خاص اہتمام سے منائی گئی۔ چار روزہ پروگرام مرتب کیا گیا۔ لیکن اس پروگرام میں کیا تھا؟ ایصالِ ثواب، قوالی، مشاعرہ، مشہور مقررین کے تقریری مظاہرے۔ یہ سب کچھ اس اقبال کی یاد میں کیا گیا جس نے برِ اعظم ہند کے نئے اسرائیلیوں کو "ارضِ موعود" کا تصور ہی نہیں خوشخبری بھی دی تھی جب انہوں نے سنہ ۱۹۳۰ء میں اعلان کیا۔

> مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام
> کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

کشمیر کمیشن اسی تاریخ (۲۱ اپریل) کو مجلس تحفظ نے کشمیر کے متعلق ایک نئی قرارداد منظور کی جو اب کے ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے قریب تر تھی۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ وہی نقطۂ نگاہ کی حامل تھی۔ اس قرارداد میں ایک کمیشن کے تقرر کا فیصلہ کیا گیا جو پاکستان اور ہندوستان کا دورہ کرے اور حالات کا بچشمِ خود ملاحظہ کرے۔ پاکستان اس امر پر زور دے رہا تھا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ آزاد استصوابِ رائے سے کرانے کا اہتمام کیا جائے اور اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ کشمیر کے ان باشندوں کو واپس لایا جائے جو مہاجرین کی صورت میں باہر جا چکے ہیں اور تمام بیرونی عناصر کو ریاست سے نکال دیا جائے جنہیں ہندوستان کشمیر میں بسا کر مسلم اکثریت کے علاقوں کو غیر مسلم اقلیت کے علاقوں میں تبدیل کرتا جا رہا ہے۔ ہندوستان "قیامِ امن" کی خاطر اپنی فوجیں ریاست میں رکھنے پر مصر تھا۔ مجلس تحفظ نے اپنی قرارداد میں یہ نقطۂ نگاہ تسلیم کر لیا کہ پاکستان اپنے باشندوں اور قبائلیوں کو ریاست سے نکالے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ہندوستانی فوج بھی واپس کر لی جائے گی۔ لیکن "قیامِ امن" کے لئے فوج ضرور باقی رہے گی۔ اس سراسر غیر منصفانہ فیصلے کے باوجود پاکستان نے کشمیر کمیشن سے پورا تعاون کرنے اور اسے ہر ممکن سہولت بہم پہنچانے کا وعدہ کیا۔

بین الاقوامی ادارہ کا فیصلہ اپنے حق میں لے چکنے کے بعد ہندوستان نے پاکستان کی سرحدوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ پاکستان اب تک جنگِ کشمیر کا خاموش تماشائی تھا۔ لیکن مئی ۱۹۴۸ء میں اسے اپنے سرحدی مقامات کے تحفظ کے لئے دفاعی کارروائی کرنا پڑی۔ پاکستان نے اپنی فوجیں ریاست کی حدود کے اندر دفاعی حیثیتوں میں متعین کر دیں تاکہ پاکستان کی غیر جانبدارانہ روش سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستانی افواج پاکستان پر باقاعدہ یلغار شروع نہ کر دیں۔ پاکستان کا یہ دفاعی اقدام مخفی نہ تھا۔ کشمیر کمیشن جب یہاں پہنچا تو سرکاری طور پر اسے اطلاع دے دی گئی کہ فلاں فلاں مقام پر اتنی اتنی پاکستانی فوج بھیجی گئی ہے۔

کشمیر کمیشن نے کشمیر کے دونوں حصوں کا دورہ کر کے اور پاکستان و ہندوستان کی حکومتوں سے

گفتگو کر کے ۱۳ اگست کو ایک قرارداد پیش کی جس میں پاکستان اور آزاد کشمیر کی حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ کشمیر سے اپنی فوجیں نکال لیں۔ ہندوستان کی فوجوں کا قیام ضروری سمجھا گیا۔ کمیشن نے دونوں حکومتوں سے التوائے جنگ کی درخواست کی اور خود عازم جنیوا ہو گیا۔ نومبر میں کمیشن نے اپنی عارضی رپورٹ شائع کی جس میں حسب سابق پاکستان کو مجرم ظاہر کیا گیا۔ یہ رپورٹ محض حالات کی ایک یادداشت ہے۔ اس میں کوئی سفارشات نہیں۔

جہادِ فلسطین

۱۵ مئی کو برطانیہ نے حسب اعلان، فلسطین کو خالی کر دیا۔ عرب لیگ کی کئی حکومتوں، خصوصیت سے لبنان، شام، مشرق اردن، عراق اور مصر نے آزادیٔ فلسطین کے لیے باقاعدہ فوجی کارروائی شروع کر دی۔ اسی تاریخ کو یہودیوں نے تل عفیف کو مرکز رکھ کر نام نہاد "اسرائیلی حکومت" قائم کر لی اور عربوں اور یہودیوں میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ امریکہ و روس نے سراسر غیر آئینی طور پر اس نام نہاد حکومت کو تسلیم کر لیا حالانکہ اصطلاحی طور پر اسے حکومت کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اسرائیلی ابھی تک یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ان کی حکومت کی حدود کیا ہیں۔

شروع جنگ میں خلاف توقع عربوں کو بہت کامیابیاں ہوئیں جن سے یہودیوں کے بین الاقوامی پروردگار بہت مضطرب ہوئے۔ انہوں نے عربوں کی ابتدائی فتوحات کا اثر زائل کرنے کے لئے اب یہ کوشش کی کہ فریقین جنگ میں عارضی صلح ہو جائے۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ یہود اس مہلت کے دوران میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ و امریکہ نے عربوں کو اسلحہ دینے سے انکار کر دیا۔ یہود کو اسلحہ بدستور پہنچتا رہا۔ مجلس تحفظ نے قضیۂ فلسطین نبٹانے کے لئے ناروے کے کاؤنٹ برناڈوٹ کو ثالث مقرر کیا۔ کاؤنٹ نے دونوں حکومتوں سے گفتگو کر کے عارضی صلح کا اہتمام کیا جس کی پابندی عربوں نے تو کی لیکن یہود اس کی پیہم خلاف ورزی کرتے رہے۔ انہوں نے اس فرصت سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے استحکام کا اور سامان کیا چنانچہ کونٹ برناڈوٹ نے مجلس تحفظ میں اعتراف کیا کہ عارضی صلح سے یہودیوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ عربوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دینے کے باوجود ثالث کی بعض "غیر جانبدارانہ" حرکات سے یہود خوش نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک روز کاؤنٹ برناڈوٹ کو قتل کر دیا۔ اقوام عالم میں اس قتل سے غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن یہود کی "بعد قتل زود پشیمانی" نے اس غم و غصہ کو جلد ٹھنڈا کر دیا۔

برناڈوٹ مرتے ہوئے ایک شر انگیز تجویز چھوڑ گئے جس میں تقسیم فلسطین کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ تجویز پیش کی گئی کہ "عرب فلسطین" کو شرق اردن کے ساتھ ملحق کر دیا جائے۔ فلسطین کی جنگ مختلف ادوار اور "التواؤں" سے گزرتی ہوئی اس حالت تک پہنچی کہ عربوں کو ہر محاذ پر شکستیں شروع ہو گئیں۔ خود عربوں کا رابطہ باہمی جو کسی وقت بھی تسلی بخش نہیں رہا، مزید پریشان ہونے لگا۔ ان کی کارروائیوں میں

تنظیم شروع سے خاطر خواہ نہیں رہی۔ غزنی میں مفتی اعظم امین الحسینی کی قیادت میں کل فلسطین حکومت کی تشکیل سے ان کا اندرونی انتشار نمایاں ہوا۔ مفتی امین الحسینی کی زیر قیادت مرتب ہونے والی حکومت کا مستقر غزنی تھا جسے بعد میں یہودی حملوں کی وجہ سے مصر منتقل کر دیا گیا۔ اس عارضی حکومت کو جملہ عرب حکومتوں نے تسلیم کر لیا مگر شرق اردن کے شاہ عبداللہ نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور وجہ یہ بتائی کہ ایسی حکومت کے قیام میں اقوام متحدہ کی تقسیمی تجویز کا عملی اعتراف ہے۔ نیز حکومت کا قیام اہالیان فلسطین کی منشا سے ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی شاہ عبداللہ نے یہ اعلان بھی کیا کہ وہ عرب لیگ کا بدستور مؤید ہے۔ آخری بیان کے باوجود ممالک عربیہ کے اتحاد میں رخنے نمایاں ہونے شروع ہو گئے۔ یکم دسمبر کو [illegible] میں مہاجرین فلسطین کے ایک گروہ کی کانگرس منعقد ہوئی۔ ظاہر ہے کہ مہاجرین جس خستہ حالی اور افراتفری میں اپنے آبائی گھروں سے نکلے ہیں اور وہ جس قابل رحم حالت میں بھوک اور بیماریوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس کے پیش نظر ان میں کسی تنظیم و ترتیب کا ہونا امر محال ہے۔ ان حالات بحالات موجودہ یہ ناممکن ہے کہ وہ اکثریت میں کہیں جمع ہوں اور فلسطین کے مستقبل سے متعلق کوئی فیصلہ کریں۔ تاہم اس نام نہاد کانگرس نے یہ فیصلہ کیا کہ شاہ عبداللہ کو تاج فلسطین بھی سنبھال لینا چاہیئے۔ اس بیک وقت افسوسناک و مضحکہ انگیز فیصلہ کو پہلے شرق اردن کے کابینہ نے قبول کیا پھر پارلیمان میں پیش کر کے اسے سند قبول عطا کرائی گئی۔ شاہ عبداللہ نے اس کے ساتھ ہی فلسطین کا "مفتی اعظم" بھی نامزد کر دیا۔ شاہ عبداللہ نے حکومت غزنی کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ اقوام متحدہ کی تقسیمی تجویز کی عملی توثیق کے مترادف ہے۔ یہی اقدام شاہ نے خود کیا یا کرایا۔ البتہ صورت اول میں یہ امکان تھا کہ ممالک عربیہ مرتب شدہ حکومت فلسطین کو تسلیم کر لیتے اور ــــ اگر اس اقدام ترتیب حکومت کو غلط بھی قرار دیا جائے تو وہ اس نقطہ پہ متحد ہو جائیں گے۔ لیکن عبداللہ کے اقدام نے اتحاد عربیہ میں عظیم رخنہ پیدا کر دیا۔ مفتی اعظم کا تقرر تو بجز بے محل تھا یہ اقدامات اتفاق و اتحاد پر کاری ضربات ہیں۔ انگریز شاہ عبداللہ کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں اور بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ دول غربی کی سازش کامیاب ہو کر رہے گی اور عربی ممالک آپس میں کٹ جائیں گے۔ شاہ عبداللہ سے یہ امر اور حیران کن ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے وحدت عربیہ کو مزید استحکام و استواری بخشنے کے لئے جون میں مصر، سعودی عرب اور عراق کا دورہ کیا۔ ابن سعود سے اس کی ملاقات بیس سال کے بعد ہوئی۔ شاہ عبداللہ نے ۱۷ جولائی کو بغداد کی ایک اخباری ملاقات میں کہا۔

میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ مصر، سعودی عرب، یمن، شرق اردن، شام، لبنان، اور عراق میں مکمل تعاون اور صحیح عزم ہے۔ یہ حکومتیں ناقابل شکست و اتحاد ہیں۔

شاہ عبداللہ نے جون کے اقدامات سے اپنے اس بیان کی عملاً تغلیط کر دی۔ عربی وحدت میں اور

کتنے پوشیدہ رکھتے ہیں اس کا جواب وقت دے گا۔

عرب عوام سلاطین عرب کے رویہ سے مطمئن نہیں۔ چنانچہ حال میں شام کی وزارت ٹوٹ گئی اور قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ شکست براہ راست نتیجہ ہے شام کی حکمت عملی متعلق فلسطین کا۔ نئی وزارت کی تشکیل شام کے لئے امر دشوار بن گئی۔ اب ہرچند وزارت مرتب ہو چکی ہے لیکن اس کے کامیابی سے چلتے رہنے کے امکانات چنداں روشن نہیں ایسے حالات سے دیگر عربی وارثانِ حکومت بھی خارج از بحث نہیں۔

مارہائے آستین کے کارنامے ۱۹۴۹ء کے گرما کے آغاز میں ہندوستان نے کشمیر میں بہت بڑی تیاریوں کے بعد ایک زوردار حملہ کیا۔ اس گرمائی حملہ کا خوب پروپیگنڈا کیا گیا۔ ہندوستان کے وزیر دفاع بلدیو سنگھ نے پورے حتم ویقین کے ساتھ اعلان کیا کہ اب آزاد کشمیر کی قوت کو چند روز میں کچل کر رکھ دیا جائے گا۔ اس حملے کے آغاز کے ساتھ ہی صوبہ سرحد کے سرخ پوشوں نے مسلمانوں میں پاکستان کی کمزوری اور مجاہدین کشمیر کی متوقع شکست کا پراپگنڈا شروع کر دیا۔ فقیر ایپی نے بھی کروٹ لی اور پاکستان کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کئی ایک مقامات پر انہوں نے مجاہدین کو کشمیر جانے سے بالجبر روکا جاتا اور شورش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہیں یقین تھا کہ اب ہندوستانی یلغار پاکستانی حدود کے اس پار ہی آکر رکے گی۔ پروگرام یہ تھا کہ جس وقت ہندوستانی فوجیں مظفر آباد تک پہنچیں سرخ پوش اور فقیر ایپی کے حواری پاکستان پر حملہ کر دیں۔ خوش قسمتی سے پاکستان نے قبائلی علاقوں سے اپنی فوجیں واپس بلا کر اور قبائلیوں کو پاکستان میں آنے جانے کی کھلی اجازت دے کر اُن کو اپنی نیک نیتی اور خیر اندیشی کا یقین دلا رکھا تھا۔ فقیر ایپی کی "توپوں" میں بھی اب وہ گرمی باقی نہیں رہی تھی۔ غیور پٹھان جانتے تھے کہ اُن کا ہمیشہ کا حریف، انگریز جا چکا ہے اور پاکستان کی مملکت قائم ہو چکی ہے۔ وہ اپنے کشمیری بھائیوں کے مصائب سے بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود بداندیشوں نے پاکستان کو پریشان کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش حکومت کی بروقت کارروائی سے ناکام کر دی گئی۔ اس سے فقیر ایپی کی طاقت بالکل ٹوٹ گئی۔ سرخ پوش جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور اس کے ممتاز قائدین کو گرفتار کر لیا گیا۔ چارسدہ (پشاور) میں سرخ پوشوں پر سختی بھی کرنا پڑی جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور یہ فتنہ اپنی موت آپ مر گیا۔ ان حفاظتی تدابیر کے سلسلہ میں ہندوستان میں جس پیچ و تاب کا اظہار کیا گیا اس سے اس امر میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہا کہ ان کارروائیوں کے پیچھے تاریں کہاں سے ہلائی جا رہی تھیں۔

پنجاب میں فتنہ "مودودیت" سر اٹھا رہا تھا۔ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی "جماعت اسلامی" جس کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ وہ پاکستان کی جنگ آزادی کی اصولاً مخالفت کرتی رہی لیکن جب کہ آزادی

اور بدکاروں کو پاکستان کے سوا کہیں پناہ بھی نہ مل سکی۔ اب پاکستان میں شرعی نظام کے داعی کی حیثیت سے نمودار ہوئی۔ اس کے ترکش استدلال کے تمام تیر یہ ثابت کرنے پر صرف ہوئے کہ مسلمانوں کی قیادت اب تک غلط ہاتھوں میں رہی ہے۔ اس قیادت کو اب بدلنا چاہیئے۔ اسی "غلط قیادت" کا حاصل پاکستان ہے۔ لہٰذا پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانے کی مہم بھی جاری رہی۔ "قرآنی نقطۂ نگاہ" سے یہ ثابت کر دیا گیا کہ جنگ کشمیر "جہاد" نہیں۔ یہ سب کچھ "شریعت" اور "اسلام" کے پردہ میں ہوتا رہا۔ آخر حکومت پنجاب نے ایک بعد از وقت جنبش کی اور امیر جماعت اسلامی کو گرفتار کر لیا اور جماعت کا کچھ لٹریچر بھی ضبط کیا۔ لیکن اس نے مسلمانوں میں معصوم طریقوں سے جو ذہنی انتشار پیدا کر دیا ہے اس کے زہریلے اثرات ہنوز وجہ پریشانی ہیں۔

پاکستان کی پہلی سال گرہ

یہ وہ حالات تھے جن میں پاکستان نے اپنی زندگی کا پہلا سال مکمل کیا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب تمام پاکستان پر جشن مسرت منایا گیا تو مسلمان پنجاب کے روز افزوں فسادات سے افسردہ خاطر ضرور تھے۔ بعد میں ریڈکلف فیصلے نے ان کی افسردگی میں مزید اضافہ کر دیا تھا لیکن وہ اپنے اس احساس کو چھپا نہیں سکتے تھے کہ وہ پہلی بار آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ اس قسم کا "پہلا موقع" ہر شخص کی زندگی میں نہیں آیا کرتا۔ ایک سال بعد، ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو جب استقلال پاکستان کی پہلی سال گرہ منائی گئی پاکستان کا زمین و آسمان ہی بدل چکا تھا۔ مغربی پاکستان سے غیر مسلم قریباً کلی طور پر منتقل ہو چکے تھے۔ اور ان کی جگہ ہندوستان سے قریباً ایک کروڑ مسلمان پاکستان پہنچ چکے تھے۔ ان میں اکثریت ان سوختہ سامانوں کی تھی جو اپنے اعزہ و اقارب اور زندگی کا اندوختہ درندہ صفت انسانوں کی نذر کر کے آئے تھے۔ آبادی کے اس غیر متوقع وسیع تبادلے سے جہاں ملک کا معاشی نظام درہم برہم ہو گیا وہاں لوگوں میں مایوسی، بددلی اور بے چینی پھیل گئی۔ ان ایک کروڑ مہاجرین کے دلوں میں ابھی تک اپنے اجڑے ہوئے آبائی گھروں کی یاد تازہ تھی۔ نئی فضا میں ابھی تک انہوں نے اپنے آپ کو مقیم محسوس نہیں کیا تھا۔ قائدین ملت اور ارباب حکومت نے عمومی طور پر مابعد تقسیم جس عدم تدبر اور اکثر مواقع پر بے حسی کا ثبوت دیا اس سے ہر شخص نالاں تھا۔ آزادی پاکستان کے ساتھ ہی جس لاقانونیت نے سر اٹھایا تھا، وہ اس حد تک بڑھی کہ خود ان لوگوں کے دلوں سے بھی قانون کا احترام اٹھ گیا جن پر قانون کو منوانے کی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ رشوت ستانی، ناجائز خویش نوازی، اور فرض میں کوتاہی، یہ وہ جرائم تھے جو انصرام ملک کے بیشتر شعبوں میں داخل ہو چکے تھے۔ غیر مسلم بنیوں کی جگہ لینے والے مسلمان بنیوں نے (الا ماشاء اللہ) چور بازاری، ناجائز نفع بازی اور ذخیرہ اندوزی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ضروریات زندگی کی غیر معمولی گرانی اور نایابی نے "قدیم" پاکستانیوں میں بھی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ الغرض ہر شخص غیر مطمئن اور شاکی تھا۔ بے اطمینانی اور بے چینی کی اس فضا میں جشن پاکستان

منایا گیا۔ ایسے مواقع پر پیشتر ازیں جو قدرتی اور بے ساختہ جوش وخروش ہوا کرتا تھا وہ اب کے نمایاں طور پر مفقود تھا۔ "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگانے والے بھونپو ضرور موجود تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نعرے ایمانی قلب سے نہیں اٹھ رہے۔ ان نعروں میں پہلی کی سی بے ساختگی نہ تھی، لہٰذا ان سے رگوں میں وہ پہلی کی سی حرارت بھی پیدا نہ ہوتی تھی۔

"اس بے تکی" کی وجہ ایک تو وہ فضا تھی جس کا اجمالی خاکہ سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ جشن پاکستان کی تقاریب سو فیصدی سرکاری تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ عوام و حکام میں اب کوئی فرق نہیں رہا تھا کیونکہ دونوں ملت پاکستان کے اجزائے لاینفک تھے۔ لیکن عوام کی یہ ذہنی خلش قابل فہم تھی کہ وہی حکام جو قیام پاکستان تک اس قدر رسوا ہو چکے تھے اور جن کا نامۂ اعمال قیام پاکستان کے بعد بھی بہت زیادہ قابل تعریف نہیں رہا، اب پیش پیش نظر آتے ہیں اور ملت کے وہ غیر سرکاری مخلص خدام جو کل تک جنگ پاکستان کے کماندار تھے، اب پولیس کی لاٹھی کے پیچھے دھکے کھاتے ہیں کہ گھیرے کے اندر ان کا قدم نہ چلا جائے۔ عوام کی اس سرد مہری کا سبب وہ عام بداعتمادی بھی تھی جو مسلم لیگ کے قائدین کے خلاف قریباً ہر جگہ پیدا ہو چکی تھی۔ عوام جب آنکھ اٹھا کر دیکھتے تھے تو ان کے قائدین ـــ سرکاری و غیر سرکاری دونوں ـــ بڑی بلندیوں پر نظر آتے تھے۔ اس بُعد کو دور کرنے کی کسی وقت بھی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ بایں ہمہ ۱۴ راگست ۱۹۴۸ء کو ہر ادنیٰ و اعلیٰ پاکستانی اس تحفظ پر مطمئن ضرور تھا جو پاکستان نے اسے بہم پہنچا دیا ہے۔

قائد اعظمؒ کا انتقال

جشن پاکستان کی ان تقاریب کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں خلاف توقع "ارض مقدس" دلانے والے "صاحب ضرب کلیم" جو اپنی بے لوث خدمت قوم کے طفیل ملت میں محبوبیت کا قابل فخر مقام حاصل کر کے "قائد اعظم" کا خطاب پا چکے تھے، ان میں شرکت نہ کر سکے۔ نوزائیدہ مملکت کو سنبھالنے کی ذمہ داریاں ہی کچھ کم نہ تھیں کہ مہاجرین ہندوستان کی آمد اور اندرونی و بیرونی خطرات کے غیر متوقع مسائل نے قائد اعظم کی پیرانہ جواں ہمتی کا اور زیادہ امتحان لیا۔ ۷۲ سال کا یہ مرد فرزانہ قوم کی نالائقیوں کو جانتا تھا۔ قوم کی آوارہ مزاجی پاکستان کے بار امانت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ یوں تو قائد اعظم کی صحت ۱۹۴۶ء سے ہی، بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں سے گرنا شروع ہو گئی تھی لیکن حصول مقصد کے بعد کے مسائل نے انہیں اور زیادہ بوڑھا کر دیا تھا۔ سال گزشتہ کا ایک ایک لمحہ قویٰ میں کمزوری پیدا کر رہا تھا۔ احساس فرض کی شدت نے استراحت ان پر حرام کر رکھی تھی۔ قیام کراچی سے ان کی گوناگوں مصروفیتوں میں تو اضافہ ہو جاتا تھا اس سے بچنے کے لئے گرما میں زیارت (بلوچستان) چلے گئے۔ جولائی کے اواخر میں

وہ سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کرنے کے سلسلہ میں کراچی تشریف لائے۔ وقت کے تقاضوں کے اعتبار سے متمدن ممالک کے معاشی نظام میں بنکوں کو جو اہمیت حاصل ہے اُس کے پیشِ نظر سٹیٹ بنک کا قیام ترقی کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ اب تک جو فرائض ریزرو بنک آف انڈیا ادا کر رہا تھا وہ کلی طور پر پاکستان کے اس نئے قومی بنک کو سپرد کر دیئے گئے۔ اس اہم تقریب کو ادا کرنے کے بعد قائدِ اعظم پھر زیارت تشریف لے گئے۔ اسی عرصہ میں ۱۴ر اگست ۱۹۴۸ء کا تاریخی دن آیا۔ توقعات کے خلاف قائدِ اعظم یومِ آزادی کی تقاریب میں خود شرکت نہ کر سکے۔ انہوں نے ملت کے نام ایک پیغام بھیجنے پر ہی اکتفا کیا۔ قائدِ اعظم کی عدم موجودگی کو قدرتی طور پر محسوس کیا گیا اور پہلی بار ان کی صحت کے متعلق خدشات کا اظہار ہونے لگا لیکن کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ امکان نہ تھا کہ ملت کے نام یہ اُن کا آخری پیغام ہے۔

ملت پاکستان اپنے محبوب قائد کے متعلق یہ خدشات ظاہر کر رہی تھی اور عمائدینِ مملکت تسلیاں دے رہے تھے کہ قائدِ اعظم کی صحت ابھی ایسی نہیں کہ اس کے متعلق تشویش کا اظہار کیا جائے۔ پاکستان کے بہترین طبیب زیارت بھیجے گئے جنہوں نے قائد کی جان بچانے کی انتہائی کوشش کی۔ لیکن ان کی تدابیر ساعتِ موعود کو ٹالنے میں بے کار ثابت ہوئیں۔ ۱۱ر ستمبر کی شام کو انہیں کراچی لایا گیا جہاں پہنچنے کے چند گھنٹوں بعد انہوں نے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

"موت وہ پہلا دشمن ہے جس کے سامنے جناح نے اپنا سر جھکایا"۔ ایک انگریز صحافی کا یہ فقرہ معمارِ پاکستان کے عزم، جرأت اور استقلال کو بہترین خراجِ تحسین ہے۔

اس طرح صدیوں کی لامرکزیت کی شکار قوم اپنے کردار کی پختگی سے وحدتِ فکر و عمل پیدا کرنے والا قائد مسلمانوں کو دنیا کی پانچویں بڑی مملکت دلوا کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اقبالؒ نے اس لامرکز قوم کو ولولہ انگیز انداز میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا مژدہ سنایا تھا۔ جناحؒ نے دس سال کے قلیل عرصہ میں، کہ یہ مدت قوموں کی عمر میں ایک ثانیہ کے برابر بھی نہیں ہوتی، اسے ایک زندہ حقیقت کر دکھایا۔ قائدِ اعظم مر گئے لیکن پاکستان زندہ ہے۔

قائدِ اعظم کے انتقال سے ملتِ پاکستان کو بہت بڑا صدمہ ہوا۔ ملت کا آزمایا ہوا زعیم جس کی دیانت و خلوص پر کبھی شبہ کی نگاہ تک نہیں پڑ سکی تھی، باقی نہ رہا۔ قائدِ اعظم کی حیثیت ایک سیاسی لیڈر اور مملکت کے ایک گورنر جنرل سے زیادہ ایک بزرگ خاندان کی سی تھی۔ سب اُن سے ڈرتے تھے اور سب اُن کا احترام کرتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا کوئی جانشین نہ تھا۔ قدرتی طور پر قوم کے لئے یہ ایک عظیم نقصان تھا۔ پاکستان اس عظیم سانحہ ملی پر اظہارِ رنج و الم کر رہا تھا اور بدخواہانِ پاکستان یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ اب پاکستان چند روز میں ختم ہو جائے گا۔ خود اندرونی طور پر بھی استحکام کے اندیشے ظاہر کئے گئے۔ لیکن بعد کے واقعات

نے بتا دیا کہ مرحوم و مغفور قائدِ اعظم کے الفاظ میں

پاکستان قائم ہو چکا ہے اور قائم رہے گا۔

قائدِ اعظم کے آئینی جانشین مشرقی پاکستان کے وزیرِ اعظم، خواجہ ناظم الدین، کابینہ کے متفقہ فیصلے سے مقرر ہوئے۔ یہ امر اطمینان بخش تھا کہ کابینہ کا یہ فیصلہ متفقہ تھا اور اس انتخاب پر عمومی طور پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔

سقوطِ حیدرآباد

قائدِ اعظم کے انتقال کا صدمہ ہی کچھ کم نہ تھا کہ ہندوستان نے ایک اور چرکہ لگا کر مسلمانوں کو اور زیادہ سوگوار کر دیا۔ یہ ذکر ہو چکا ہے کہ حیدرآباد کو بجبر اپنے ساتھ ملانے کے لئے ہندوستان تمام قسم کی غیر آئینی و غیر اخلاقی حرکات کر رہا تھا۔ اس کے خلاف حکومت حیدرآباد نے اقوامِ متحدہ کی مجلسِ تحفظ سے فریاد کی۔ مجلسِ تحفظ ابھی ابتدائی رسومات سے فارغ نہ ہونے پائی تھی کہ ہندوستان نے نظام کے ساتھ درپردہ سودا بازی کر کے حیدرآباد کے خلاف فوج کشی کر دی جسے ہندوستان نے ڈچ استعماریت کے تتبع میں پولیسی کارروائی سے تعبیر کیا۔ یہ کارروائی قائدِ اعظم کے انتقال سے تین روز بعد کی گئی۔ بیرونِ حیدرآباد یہ یقین تھا کہ حیدرآباد ہندوستان کے لئے اسٹالن گراڈ ثابت ہوگا۔ لیکن نظام نے جس طریق پر ہتھیار ڈالے اس نے دنیا کو مبہوت کر دیا۔ مہذب دنیا ہٹلریت کے اس تازہ ترین کارنامے پر مضطرب ہوئی لیکن مہاتما گاندھی کے فلسفۂ عدمِ تشدد پر ایمان رکھنے والے ہندوستان کو اس دراز دستی کو، پولیسی کارروائی کہنے میں شرم محسوس نہ ہوئی۔ حیدرآباد میں فوجی آمریت قائم کر دی گئی۔ ریاست کو سنسر کی فولادی دیواروں میں محصور کر دیا گیا۔ ریاست کے اندر کیا کچھ ہوا اور اب تک کیا کچھ ہو رہا ہے؟ اس کی تفاصیل ملنا مشکل ہے لیکن پیشتر ازیں ہندوستان میں جو کچھ ہو چکا ہے اس کی روشنی میں کچھ اندازہ کر لینا مشکل نہیں۔ ریاست میں مسلمانوں کے جان و مال کا کوئی محافظ نہیں۔ مسلمانوں کو کلی طور پر غیر مسلح کر دیا گیا ہے۔ اختیار کے تمام مقاموں سے ان کو ہٹا کر ان کی جگہ غیر مسلموں کو مقرر کیا جا رہا ہے۔ مسلمان اخبارات کو عملاً بند کر دیا گیا ہے۔ ہر زندہ مسلمان کو "رضاکار" کہہ کر پریشان کیا جا رہا ہے۔ فوجی گورنر کبھی کبھی "معمولی سے فرقہ وارانہ فساد" کی خبر دیدیتے ہیں لیکن ریاستی کانگرس کے ہندو صدر چیخ و پکار کر رہے ہیں کہ ریاست میں بدامنی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے۔ ریاست کا آئینی مستقبل کیا ہوگا؟ اس کا باضابطہ فیصلہ تاحال نہیں کیا گیا لیکن اس کی نوعیت خواہ کچھ ہو نتیجہ ہر حالت میں ایک ہی ہوگا۔

پاکستان نے مجلسِ تحفظ کو بار بار جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے لیکن لیت و لعل کے بعد آخر کار

مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا ہے۔ ڈاکو جب راہ گیر کو لوٹ چکیں تو اقوام متحدہ کا میثاق ان کو مجرم سمجھتا اور ان سے جواب طلب کرنے کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔

پاکستان کے خلاف اعصابی جنگ

جوناگڑھ اور مانا وادر کے بعد حیدرآباد کی فتح کو ہندوستان نے اپنی فوجی فتح سمجھ لیا۔ قائد اعظم کی وفات کے فوراً بعد سقوط حیدرآباد کی خبر مسلمانوں کو افسردہ کرنے کے لئے کافی تھی۔ اس سے ہندوستان نے یہ سمجھ لیا کہ اس کا مقصد پورا ہو گیا ہے اور وہ پاکستان میں مایوسی و شکست خوردگی کے جذبات پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس زعم میں اکڑ جو بحمد اللہ جلد ہی باطل ثابت ہو گیا، وزیر اعظم ہندوستان پنڈت جواہر لال نہرو نے نہایت مصلحانہ انداز میں مسلمانان پاکستان کو مخاطب کر کے کہا کہ "انہیں ہماری طرف سے بدگمانی اور خوف کے جذبات کو دور کر دینا چاہیئے"۔ انہوں نے نہایت متکبرانہ انداز میں کہا۔

> ہم فوجی اور قانونی نقطۂ نگاہ سے پاکستان پر حملہ کرنے میں حق بجانب ہوتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم مہاتما گاندھی کے متبع ہیں لہذا تشدد کا جواب تشدد سے دینا نہیں چاہتے۔

اسی تقریر میں ذرا آگے چل کر کہا۔

> ہمارا حملہ نہ کرنا کمزوری کی وجہ سے نہیں۔ آپ نے ہماری قوت تو دیکھ ہی لی ہے۔

اسی زعم باطل میں پاکستان کو اور زیادہ پریشان کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب پاکستان کے ایک کمزور نقطہ "مشرقی بنگال" کا انتخاب کیا گیا۔ ان ہی دنوں عید الاضحٰی کے موقع پر کلکتہ میں خون مسلم کی ارزانی کا مظاہرہ کیا گیا اور اس کے متوقع ردعمل سے پیشتر ہی یہ غوغا آرائی شروع کر دی گئی کہ مشرقی بنگال میں ہندوؤں کا جینا محال کر دیا گیا ہے اور وہ وسیع پیمانے پر ہندوستان آنا شروع ہو گئے ہیں عملی طور پر اس قسم کا کوئی انخلا نہیں ہوا تھا۔ لیکن نشر و دروغ کے اس فن کے ذریعے، جسے پراپیگنڈا کہا جاتا ہے، ہندوستان نے دنیا سے نہ صرف یہ کہ اس قسم کا انخلا واقعی ہو رہا ہے بلکہ یہ بھی منوانا چاہا کہ مشرقی بنگال میں ہندوؤں کو دھڑا دھڑ گرفتار کیا جا رہا ہے، انہیں جبراً مسلمان کیا جا رہا ہے اور ہندو خواتین کو اغوا کیا جا رہا ہے۔ اس منظم پراپیگنڈہ کے ساتھ ہی نائب وزیر اعظم ہندوستان مسٹر پٹیل نے یہ دھمکی دی کہ اگر ہندوؤں کا یہ (مفروضہ) انخلا یونہی جاری رہا تو ہم اس سوا کروڑ آبادی کو کھپانے کے لئے پاکستان سے کافی علاقے کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ اور اگر پاکستان نے انکار کیا تو ہم اس پر چڑھائی کر دیں گے۔ پاکستان کے خلاف اس اعصابی جنگ کو تیز کرنے کے لئے "سٹیٹسمین" کے سیاسی وقائع نگار کی زبان قلم سے یوں کہلوایا گیا کہ مسٹر پٹیل کی یہ دھمکی محض زور خطابت کا نتیجہ نہیں بلکہ اعلیٰ حلقوں میں پاکستان سے اس قسم کا مطالبہ کرنے کے متعلق

سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔ اس قسم کی خبریں بھی نشر کی گئیں کہ کشمیر میں جنگ کو تیز تر کرنے کے ساتھ مشرقی پاکستان میں گڑبڑ پیدا کر کے پاکستان کے لئے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

ہندوؤں کے افسانوی انخلاء کا پراپیگنڈہ ابھی تک جاری ہے، حالانکہ خود مشرقی پاکستان کے ہندو اس پراپیگنڈے کو بے بنیاد ثابت کر چکے ہیں۔ ہندوستانی ہائی کمشنر متعینہ پاکستان "مسٹر سری پرکاش" مشرقی پاکستان گئے۔ انہیں بڑی کد و کاوش کے بعد اسی قدر سمجھ آسکا کہ وہاں کے ہندوؤں کا مسئلہ "روحانی" ہے۔ ان کے بیان کردہ اسباب کے مطابق جو ہندو ابھی کل تک ہندوستان کے ساتھ اس قدر جذباتی وابستگیاں رکھتے تھے ان کو انتقالِ وفاداری کچھ مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ "ہندوستان ٹائمز" کے نامہ نگار نے اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے بتایا

> یہاں (مشرقی پاکستان) کے نوجوان ہندوؤں نے آزادی وطن کی تحریک میں بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں۔ وہ اب اس (مسلمانوں کی حکومت کے زیر تابع) زندگی سے کبھی موافقت نہیں کر سکتے جسے وہ ذلت آمیز سمجھتے ہیں۔
>
> ہندوستان ٹائمز [illegible]

محاذِ کشمیر

اس اعصابی جنگ کے ساتھ ہی ہندوستان نے کشمیر میں وسیع پیمانے پر حملہ شروع کر دیا۔ اس کا یہ اقدام اس صریح وعدہ کے خلاف تھا جو کشمیر کمیشن سے ہندوستان و پاکستان دونوں کر چکے تھے۔ اس وعدہ کے مطابق دونوں مملکتوں کو کوئی ایسی کارروائی کرنے سے اجتناب کرنا چاہیئے تھا جس سے قضیۂ کشمیر میں مزید الجھاؤ پیدا ہو۔ اسی عرصہ میں کشمیر کمیشن نے اپنی عارضی رپورٹ شائع کی جس کا ذکر آچکا ہے۔ وزیر خارجہ پاکستان نے کمیشن کے صدر کی توجہ ہندوستان کی وعدہ شکنی کی طرف مبذول کرائی اور یہ بھی لکھا کہ اگر موجودہ صورت حالات جاری رہی تو پاکستان کشمیر میں مدافعانہ کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ ہندوستان وعدہ شکنی کے "الزام" سے ابھی تک انکار کر رہا ہے اور کشمیری مہاجرین کے قافلے آزاد کشمیر و پاکستان میں ہر روز پہنچ رہے ہیں۔ پاکستان کے وزیر مہاجرین و آبادکاری کے اخباری اعلان کے مطابق اوائل دسمبر تک تین لاکھ کے قریب کشمیری مہاجرین پاکستان آچکے تھے اور ہر روز ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے حالیہ اجلاس پیرس کے آخری ایام میں پاکستان و ہندوستان کے ساتھ قضیۂ کشمیر کے سلسلہ میں مذاکرات ہوئے جن کی تفاصیل منظر عام پر نہیں آسکیں۔ کمیشن کے ارکان واپس آچکے ہیں۔ دونوں حکومتوں سے نامہ و پیام شروع کر دیا گیا ہے۔ جس رفتار اور انداز سے اب تک اس قضیہ کو نپٹانے کی کوشش کی گئی ہے اس کے پیش نظر کمیشن کی کارگزاری

کوئی خوش آیند توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں۔ کبھی کبھی تقسیم کی "ناہی" تجویز بھی سننے میں آتی ہے لیکن پاکستان و آزاد کشمیر نے ابھی تک اس پر غور کرنے پر آمادگی کا اظہار نہیں کیا۔ کشمیری مجاہدین اپنی بے سروسامانی کے باوجود اس عزم کے ساتھ اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں کہ کشمیر کا فیصلہ میدان جنگ میں ہی ہو گا۔

پاکستان و ہندوستان کی کانفرنسیں

پاکستان و ہندوستان کی اس باہمی کشیدگی کی فضا میں ۱۹۵۱ء کے ربع آخر میں دو اہم اجتماعات ہوئے۔ لندن کی کامن ویلتھ کانفرنس جو وسط اکتوبر میں منعقد ہوئی کم و بیش ایک مجلسی اجتماع تھا۔ اس کانفرنس کے علاوہ وزیر اعظم برطانیہ و وزرائے اعظم پاکستان و ہندوستان کی "تکونی" کانفرنس بھی ہوئی جس میں کشمیر کے متعلق صاف گوئی سے باتیں ہوئیں لیکن مفاہمت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ دولت مشترکہ کی اس پہلی کانفرنس کا فائدہ یہ ہوا کہ پاکستان کو زیادہ سے زیادہ حلقوں میں روشناس ہونے کا موقع ملا۔

دسمبر میں دہلی میں پاکستان و ہندوستان کے نمائندوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں کئی ایک متنازعہ امور پر قول و قرار ہو گئے (کانفرنس کے مسائل زیر بحث میں مسئلہ کشمیر شامل نہ تھا) اس مفاہمت پر اظہار مسرت کیا گیا۔ لیکن یہ دیکھنا ہے کہ ان قول و قرار کی پابندی فریقین کریں گے یا نہیں۔ سابقہ تجربہ تو یہی ظاہر کرتا ہے کہ اس کی پابندی یک طرفہ ہو گی۔ مسٹر پٹیل نے جلد ہی ثبوت مہیا کر دیا کہ جذبات خیر سگالی و خوش دلی کا یہ اظہار یک طرفہ ہے۔ عین اس وقت جبکہ پاکستان میں بین المملکتی معاہدہ پر اظہار اطمینان کیا جا رہا تھا، گاندھی نگر (جے پور) میں مسٹر پٹیل کف بر دہان، پاکستان کے خلاف غیظ و غضب کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

ہندوستانی قومیت کا ایک اور مرحلہ

یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہندوستانی پارلیمان کی منظور کردہ ایک قرارداد کے مطابق جداگانہ جماعتوں کی تنظیم کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ نومبر ۱۹۵۱ء تک (انگریزی حکومت کے زمانہ سے لے کر) مسلمانوں کے شخصی آئین (پرسنل لاء) کو نہیں چھیڑا گیا تھا۔ مسلمانوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنے معاملات نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ کو شریعت کے مطابق فیصل کریں یا رواج کے مطابق۔ ہندوستان کی غیر دینی "Secular" حکومت کو مسلمانوں کی اتنی سی آزادی بھی گوارا نہ ہوئی اور نومبر میں مجوزہ ضابطہ آئین میں ایک شق کا اضافہ کر کے اُن سے یہ اختیار چھین لیا گیا ہے۔ ہندوستان کے وزیر قانون کے الفاظ میں ہندوستانی قومیت متحدہ کی تشکیل میں یہ گوشہ ابھی تشنۂ توجہ

رہ گیا تھا۔ اور مسٹر منشی کے الفاظ ہیں

> ہم ملک کے مختلف باشندوں کے شخصی قوانین کو اس لئے یکجا اور یکساں کرنا چاہتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد تمام ملک کی روش زندگی یکساں اور غیر دینی ہو جائے۔

اسطرح ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح بتدریج ہندوستان کے مسلمانوں سے قومی تشخص کی ہر امتیازی علامت کو ایک ایک کرکے ختم کیا جا رہا ہے۔ جہاں ضرورت پڑتی ہے قانون کی مدد سے یہ مقصد پورا کیا جاتا ہے اور جہاں قانون کی حدود کو ہم تنگ پاتے ہیں۔ قانون کو نوک شمشیر الگ کر دیا جاتا ہے۔ یہی وہ "قتلِ نسل" ہے جسے ادارۂ اقوام متحدہ میں پاکستان نے خلاف قانون قرار دینے کے لئے انتہائی کوشش کی لیکن ہندوستان نے اس تجویز کی مخالفت کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس اعتبار سے سب سے پہلا اور سب سے بڑا مجرم خود ہندوستان ہوگا۔ ہندوستان کے اسی مجرم ضمیر کا اظہار مسز وجے لکشمی نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں یوں کیا تھا۔

> ہم نے بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ میں پورے عجز و ندامت سے اعتراف کرتی ہوں کہ ہم مہاتما گاندھی جیسے لیڈر کے ناخلف ثابت ہوئے ہیں۔

لیکن اسی زمانہ میں ابوالکلام آزاد نے دہلی کی جامع مسجد میں قبلہ رو ہو کر حلفیہ اعلان کیا کہ ہندوستان نے اب تک کوئی ایسا کام نہیں کیا جس پر انہیں خدا یا انسانوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔

ان دنوں ہندوستان میں راشٹریہ سیوک سنگھ نے انفرادی سول نافرمانی شروع کر رکھی ہے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ سنگھ پر سے قانونی پابندیاں اٹھا دی جائیں۔ یا "پاکستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا جائے۔"

انڈونیشیا

اواخر دسمبر میں ولندیزی حکومت نے انڈونیشیا کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے جو جارحانہ اقدام کیا ہے اس نے مہذب دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ ہم سال ولندیزی انڈونیشی نزاع کو ختم کرنے کے لئے۔ اقوام متحدہ نے ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔ جس نے جنوری ۱۹۴۸ء میں فریقین سے التوائے جنگ کی تجویز منظور کرائی تھی۔ پچھلے دنوں ولندیزی اور انڈونیشی حکام میں مذاکرات مصالحت شروع ہوئے لیکن متضاد نقطہ ہائے نگاہ میں مفاہمت کی راہ نہ پیدا ہو سکی۔ اپنے آزاد مقام کو برقرار رکھتے ہوئے مفاہمت کی جو ممکن صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں انڈونیشی نمائندوں نے وہ پیش کیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کا عہد کیا لیکن ولندیز ان سوائے استعماریت کے احترام کے اور کچھ نہیں چاہتے تھے۔ بالآخر یک لخت ولندیزی افواج نے انڈونیشیا کے پایۂ تخت پر قبضہ کر کے جمہوریہ کے اکثر اعلیٰ افسروں کو گرفتار کر لیا۔ انڈونیشی گوریلا جنگ [illegible] ہیں۔ ابھی جنگ [illegible]

لئے وہاں کے جنگلات مفید ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ انڈونیشی گوریلے ولندیزی اقدام کو ناکام کر سکیں گے۔

ڈچ نے انڈونیشی آزادی اور وحدت کو کچلنے کے لئے کئی چالیں چلیں۔ انہوں نے ایک طرف انڈونیشی ریپبلکن لیڈروں کی بنائی ہوئی انڈونیشی جمہوریت کی اقتصادی ناکہ بندی شروع کر دی۔ ایسے افراد و عناصر جو ذاتی اغراض کے لئے ایسے موقعوں سے فائدہ اٹھانے کی تلاش میں رہتے ہیں، ان کو ڈچ نے ابھارا اور جمہوریت کے خلاف اکسانا شروع کر دیا۔ موسو Musso جو ان ہی دنوں ماسکو سے ہدایت لے کر واپس آیا تھا، کمیونزم کا علم لے کر آمادہ بغاوت ہوا۔ ستمبر میں اسے ابتدائی "فتوحات" بھی حاصل ہوئیں۔ ڈچ بہت خوش تھے کہ موسو کامیاب ہو رہا ہے۔ ان کی اصلی خوشی اس لئے نہیں تھی کہ انہیں اشتمالیت سے محبت تھی بلکہ وہ موسو کو جمہوریت کا حریف سمجھتے تھے اور خوش تھے کہ جمہوریت کمزور ہو گئی تو وہ امریکی امداد سے جو "مارشل منصوبہ برائے یورپ" کے نام سے مغربی یونین یورپ کے رکن ہالینڈ کو یورپ میں مل رہی تھی۔ جمہوریت کو شکست دینے اور استعماری استحصال کے لئے استعمال کر سکیں گے۔ انہوں نے مشرقی انڈونیشیا اور مغربی جاوا کے بعض حصوں میں علیحدہ نام نہاد جمہوریتیں بھی قائم کر دیں تاکہ مفاہمت و مصالحت کے موقع پر جمہوریہ انڈونیشیا کے مقابلہ میں ان مہروں کو بڑھایا جا سکے۔

ڈچ کی طرف سے اعلان ہوا کہ وہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء تک انڈونیشی فیڈریشن کا قیام کر دیں گے۔ جمہوری زعماء نے اس کی عملی تشکیل سے متعلق سلسلۂ گفتگو کا آغاز کیا۔ یہ مذاکرات اقوامِ متحدہ کے صلح کرانے والے کمیشن کے زیرِ سایہ ہو رہے تھے۔ جمہوری لیڈروں نے مصالحت کی متعدد تجاویز پیش کیں لیکن ڈچ انہیں ٹھکراتے رہے۔ تا آنکہ ۱۹ دسمبر کی رات کو انہوں نے اچانک جمہوری دارالحکومت اور دیگر اہم مقامات پر قبضہ کر لیا اور جمہوری لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ یہ جارحانہ اقدام دوسرا "پولیسی اقدام" تھا جو ڈچ نے انڈونیشیا میں کیا۔ اس معاملہ کو اقوامِ متحدہ کی مجلس تحفظ میں پیش کیا گیا تو ۲۴ دسمبر کو مجلس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں فریقین سے اپیل کی گئی کہ وہ جنگ فی الفور بند کر دیں اور جنگ سے پہلے کی حدود تک واپس ہو جائیں۔ ڈچ، روسی نمائندہ کے الفاظ میں، کئی دنوں تک ان چند سطروں کی قرارداد پر غور کر کے کسی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے۔ مجلس تحفظ نے ایک بار پھر دنیا کو جتا دیا کہ اس سے انصاف اور فوری اقدام کی توقع عبث ہے۔

یہ ہے ۱۹۴۸ء کا وہ سال جو "نئے سال کی رسمی مبارکبادیوں" سے شروع ہو کر، دنیا کو "پیامِ امن و سلامتی دینے والے مسیحا" کے یومِ پیدائش کی رسمی خوشیوں پر ختم ہوا اور جس میں دنیا بدستور آغشتۂ خاک و خون ہوتی رہی۔ مظلوم بدستور تڑپتے اور ظالم بدستور اکڑتے رہے۔ اخوت

مساوات، احترامِ آدمیت کے انسان فریب الفاظ بدستور فضا میں چکر لگاتے رہے۔ انسان یہ سب کچھ کرتا رہا اور آسمان کے ستارے اس کی ان طفلانہ حرکتوں پر ہنستے ہوئے بدستور یہ گیت گاتے رہے کہ

گرمیِ کارزار ہا
خامیِ پختہ کار ہا
تاجِ سرِ بریدہ ہا
خواریِ شہریار ہا
بازیِ روزگار ہا ——— می نگریم و می رویم

خواجگی و سروری گذشت
بندہ و چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت
دورِ سکندری گذشت
شیوۂ بت گری گذشت ——— می نگریم و می رویم

زہرہ طلسمِ چون و چند
عقلِ تو در کشاد و بند
مثلِ غزالِ در کمند
زار و زبون و دردمند
ما بہ نشیمنِ بلند ——— می نگریم و می رویم

پیشِ تو فردِ ما کسے
سالِ تو پیشِ ما دمے
اے بکنارِ تو یمے
ساختہ بہ شبنمے
ما بہ تلاشِ عالمے ——— می نگریم و می رویم

قارئین طلوع اسلام کی خدمت میں

ناظم ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے چند ضروری گزارشات

برادران عزیز۔

طلوع اسلام (دور جدید) کی زندگی کا ایک سال پورا ہو گیا۔ اس پرچہ سے اس کا دوسرا سال شروع ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پرچے کے خریداروں کو اس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی کہ اس کے انتظامی کاروبار میں کیا دشواریاں پیش آتی ہیں۔ لیکن بعض امور ایسے ہیں جو بلا وجہ غلط فہمیوں کا موجب بن جاتے ہیں۔ ان کے ازالہ کی کوشش نہایت ضروری ہے۔

۱) احباب شکوہ سنج ہیں کہ پرچہ کو بصیغہ رجسٹری منگوانے پر -/۴/۲ سالانہ زاید دینے پڑتے ہیں جو مفت کا بوجھ ہے۔ ہمیں اس باب میں ان سے بھی زیادہ احساس ہے کہ یہ پیسے نہ ان کے کسی کام آتے ہیں نہ ہمارے۔ لیکن ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اس کا علاج کیا کریں۔ آپ یقین مانئے کہ بلا رجسٹری بھیجے ہوئے پرچوں میں سے پچاس فی صدی اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچتے۔ آپ خیال فرمائیے کہ ہر ماہ اس قدر پرچے دوبارہ بھیجنے سے کوئی پرچہ زندہ رہ سکتا ہے؟ جس حزم و احتیاط سے ہم پرچے ڈاک میں ڈالتے ہیں شاید ہی کہیں ایسا التزام ہو۔ لیکن اس کے باوجود شکایتوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ ہم شکر گزار ہوں گے اگر آپ ہمیں مشورہ دیں کہ ہم اس باب میں کیا کریں۔

۲) بعض احباب کی کیفیت یہ ہے کہ تین تین ماہ بعد اطلاع دیتے ہیں کہ فلاں مہینہ کا پرچہ نہیں پہنچا۔ دوبارہ بھیجئے۔ فرمائیے! ان احکام کی تعمیل کیسے ہو سکتی ہے۔ بعض دوستوں نے سال کا چندہ ختم ہونے پر پہلی مرتبہ شکایت لکھی ہے کہ سال میں تین پرچے نہیں ملے۔ جو شکایت متعلقہ مہینہ کے بعد موصول ہوگی اس کی تعمیل سے ہم قاصر ہوں گے۔ یہ یاد رکھئے۔

۳) ایک شکایت یہ ہے کہ کاغذ اچھا نہیں لگایا جاتا اور ضخامت کم کر دی گئی ہے۔ کاغذ کے متعلق گزارش یہ ہے کہ قانوناً کوئی پرچہ نیوز پرنٹ (اخباری کاغذ) کے علاوہ دوسرے کاغذ پر چھپ نہیں سکتا (بجز ان پرچوں کے جو خود حکومت کی طرف سے شائع ہوتے ہیں)، اس لئے جب تک یہ قانون موجود ہے ہم مجبور ہیں۔ باقی رہی ضخامت۔ تو شروع شروع میں طلوع اسلام کھلی سطر پر لکھا جاتا تھا اور اس کی ضخامت قریباً سو صفحات یا اس سے زیادہ ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد اس کی سطر باریک کر دی گئی جس سے اس کی ضخامت تو کم ہو گئی

لیکن مضامین میں تعطل کبھی نہیں ہوتی۔ لہذا یہ شکایت غلط فہمی پر مبنی ہے۔

طلب
۴) اگر میں یہ عرض کر دوں کہ طلوع اسلام کو اس ایک سال میں کس قدر خسارہ ہوا ہے تو اسے رجوع کیا جاسکتا۔ لیکن یہ صرف ان احباب کی اطلاع کے لئے عرض ہے جو چاہتے ہیں کہ طلوع اسلام زندہ رہے پرچے خریداروں کی زیادتی اور اشتہارات کی آمدنی پر زندہ رہتے ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ طلوع اسلام آپ کے تعاون کا مستحق ہے، تو ان دونوں شعبوں میں اس کے لئے کوشش فرمائیے۔ مستقل خسارہ کی متحمل تو کوئی پرچہ بھی نہیں ہو سکتا۔

۵) دسمبر کے پرچہ کے ساتھ جن احباب کا چندہ ختم ہوتا تھا انہیں فرداً فرداً خطوط لکھے گئے تھے۔ ان میں بعض احباب کی طرف سے نہ تو چندہ ہی موصول ہوا ہے نہ کوئی اطلاع۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ ان تک اطلاعی خط نہ پہنچا ہو یا انہوں نے اس باب میں ابھی تک تساہل برتا ہو۔ جنوری کا پرچہ ان تمام احباب کے نام حسب سابق بھیجا جا رہا ہے۔ اگر وہ تجدید خریداری پسند فرماتے ہیں تو براہ کرم چندہ ارسال فرما دیں۔ ورنہ کم از کم اطلاع تو دیدیں تاکہ پرچہ نہ بھیجا جائے۔

۶) ڈاک کا انتظام ابھی تک خاطر خواہ نہیں ہوا۔ اس لئے اگر خط و کتابت یا وصولی چندہ وغیرہ کے ضمن میں آپ کو بروقت اطلاع یا جواب نہ مل سکے، تو اس سے برافروختہ نہ ہو جایا کریں۔ ہو سکتا ہے کہ غلطی ہماری نہ ہو یا ہماری غلطی ہو اور سہواً ایسا ہو گیا ہو۔

۷) آپ جس طریق سے بھی کوئی رقم ادارہ کو بھیجیں گے، ادارہ کی طرف سے اس کی چھپی ہوئی رسید آپ کو بھیجی جائے گی۔ یہی رسید وصولی رقم کی سند ہو گی۔ اس لئے اگر آپ کو ایسی رسید نہ ملے تو براہ کرم ہمیں اس سے مطلع فرمائیں۔ اس رسید کے بغیر ادارہ کسی رقم کو ادا شدہ تسلیم نہیں کرے گا۔ منی آرڈر، وی پی، چیک، نقدی، ہر صورت میں رسید بھیجی جائے گی۔

۸) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ والا لفافہ بھیجئے۔

۹) آپ کا تعاون اور مشورہ، ادارہ کے لئے شکر گزاری کا موجب ہوں گے۔

والسلام

ناظم ادارہ طلوع اسلام - کراچی۔

احباب سے معذرت

مکرمی ۔ سلام مسنون ۔ براہ کرم ذیل کی سطور طلوع اسلام میں شائع فرما کر شکرگزار فرمائیں۔

مجھے یوں تو یہ شکایت ایک عرصے سے تھی، لیکن سال گزشتہ سے یہ زیادہ شدت اختیار کر رہی ہے، کہ مجھے شکلیں پہچان میں نہیں رہتیں (جس طرح بعض لوگوں کو نام یاد نہیں رہتے)۔ ملنے والے احباب تشریف لاتے ہیں اور سابقہ تعارف اور جان پہچان کی بنا پر بے تکلف ملتے ہیں۔ لیکن میں سوچتا رہتا ہوں کہ انہیں اس سے پہلے کہاں دیکھا ہے! اور کچھ یاد نہیں پڑتا۔ ایسے ہی بعض ملنے والے راستہ چلتے ہوئے میرے پاس سے گزر جاتے ہیں اور میں بالکل نہیں پہچان سکتا۔ اس سے جس قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں وہ میرے لئے سخت قلبی اذیت کا باعث ہوتی ہیں۔ اطباء اسے ایک قسم کا دماغی مرض قرار دیتے ہیں۔ دیگر امراض تو جسمانی تکلیف کا موجب ہوتے ہیں اور ان کا اثر مریض تک محدود رہتا ہے لیکن یہ ایک ایسا مرض ہے کہ اس کی تکلیف یکسر ذہنی ہے اور اس کا اثر مجھ سے زیادہ ملنے والوں کے دل پر پڑتا ہے۔ چونکہ میرے ملنے والوں میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق میرے علمی مشاغل سے اشتراک و ہم آہنگی کی بنا پر ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا کہ میں طلوع اسلام کی وساطت سے اپنی اس معذوری کو ان تک پہنچا دوں تاکہ یہ میری طرف سے اس باب میں کسی سابقہ غلط فہمی کے ازالہ اور آئندہ کی غلط فہمیوں کے لئے سد باب کا موجب بن سکے۔ مجھے اپنے احباب سے فی الواقعہ شرمندہ ہونا پڑتا ہے لیکن مریض معذور ہوتا ہے۔ یہی معذرت میں اُن کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ کہ ان کے دل میں ذرا سی غلط فہمی کا احساس، میری راتوں کی نیند اچاٹ کر دیتا ہے

می پرد رنگم چو صاحب گر بد بیاں بشکند

والسلام

پرویز

۲۵ دسمبر ۱۹۶۸ء

مختصرات

ترقی

پراگ میں کمیونسٹ حکومت قائم ہو جانے کے بعد، دو بھنگی سڑک کے کنارے بیٹھے یہ باتیں کر رہے تھے۔

ایک — اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس انقلاب سے مزدوروں کی حالت میں بڑی اصلاح ہو گئی ہے۔

دوسرا — خاک اصلاح ہو گئی ہے۔ جیسے پہلے تھی ویسی ہی اب ہے۔ انقلاب سے پہلے ہم سے وعدے کئے جاتے تھے کہ اس کے بعد حکام کی باری آئے گی کہ وہ سڑکوں پر جھاڑو دیا کریں اور غلاظت اٹھایا کریں۔ اب کیا ہو رہا ہے؟ یہ غلیظ کام بدستور ہم ہی کر رہے ہیں!

پہلا — اوہ! تم یہ بھول گئے کہ اب ہم خود حاکم ہیں!!

(نیو یارک ٹائمز)

مجبوریاں

چودھری فتح خاں نے بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"پردہ کے خلاف آپ کے دلائل تو بیشک قوی ہیں۔ لیکن ہوا آپ کے ساتھ بھی یہی ہے کہ آپ کی بیگم صاحبہ نے پردہ پہلے اٹھایا ہے اور دلائل آپ نے بعد میں فراہم کئے ہیں"

مستقبل

اس وقت دنیا میں صرف دو آزاد مملکتیں ہیں۔ برطانیہ بھی آزاد نہیں ہے۔ ایٹم بم کی جنگ کے بعد صرف ایک رہ جائے گی۔

(برٹرینڈ رسل — برطانیہ کا مشہور فلاسفر)

اللہ کی مرضی

شاہ فاروق کے اپنی بیوی فریدہ کو طلاق دینے پر حکومت مصر کی طرف سے جو منشور شائع ہوا ہے اس میں لکھا ہے کہ

"اللہ کی حکمتِ بالغہ نے شاہ فاروق اور ملکہ فریدہ کے دل میں یہ ڈال دیا کہ وہ علیحدہ ہو جائیں حالانکہ وہ دونوں اس فیصلہ پر متاسف ہیں"

تقدیر کا وہی پرانا مسئلہ جسے بنی امیہ کے مستبد بادشاہوں نے اپنے ناروا افعال کے لئے بطور سپر وضع کیا تھا اور جس میں اپنے ہر فیصلہ کو "خدا کی حکمتِ بالغہ" کی طرف منسوب کر کے، اس فیصلہ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جانے کا آسان طریقہ اختیار کر لیا جاتا ہے اور نہیں سمجھا جاتا کہ یہ کتنی بڑی خود فریبی بلکہ خدا فریبی ہے۔

اربابِ فکر و نظر کا فریضہ!

محترم غلام محمد صاحب، وزیرِ مالیات (پاکستان) نے اسمبلی میں بلیک مارکیٹ سے متعلق بل پیش کرتے ہوئے ملک کے اربابِ فکر و نظر سے اپیل کی کہ

"انہیں چاہیئے کہ اپنے زاویۂ نگاہ میں تبدیلی پیدا کریں اور حکومت کی مدد کریں۔ اور جب عوام غلطی کریں تو انہیں اس پر متنبہ کریں"

(ڈان مورخہ ۱۲/۱۲ ۴۹)

یعنی ملک کے اربابِ فکر و نظر، عوام کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کریں اور حکومت کی مدد کریں۔ حکومت کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کرنے والا کوئی نہ ہو؟

ڈسپلن

"تم نے اس فائل کو میرے گھر کیوں نہیں بھیج دیا؟ مفت میں اس قدر دیر کر دی اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟"

"جناب آپ نے اس دن فرمایا تھا کہ جب تک آپ نہ کہیں، کوئی کام گھر پر نہ بھیجا جائے"

"تم سامنے بولنے سے باز نہیں آتے؟ تمہاری زبان تمہارے قابو میں نہیں رہتی؟ تمہیں کب سلیقہ آئے گا؟"

کلرک کے چلے جانے کے بعد میں نے ارشد سے کہا کہ تم نے کس قدر نامعقول بات کی ہے۔

اس نے جواب دیا۔ "ڈسپلن اسی طرح قائم رہتا ہے۔ اسے کون بتائے کہ ڈسپلن بگڑتا ہی اس طرح سے ہے؟ ڈسپلن کا سرچشمہ دل کا احترام ہے اور احترام پیدا ہوتا ہے افسر کے کیریکٹر سے۔ نہ کہ نامعقولیت سے!

سلیم کے نام ....

سلیم! یہ دیکھکر خوشی ہوئی ہے کہ تم نے نظری مباحث سے ہٹ کر اب عملی مسائل کے متعلق پوچھنا شروع کیا ہے۔ لیکن اس سے مجھے حیرت ہوئی کہ تم نے غزل کو مقطع سے شروع کردیا۔ تمہیں پہلے نکاح کے متعلق پوچھنا چاہئے تھا۔ پھر ازدواجی زندگی کے فرائض وحقوق کی بابت اور آخر میں طلاق کے متعلق۔ لیکن خیر! اگر تم یوں بہتر سمجھتے ہو تو یونہی سہی۔ تم نے جن لغو روایات اور شرمناک رسومات کا ذکر کیا ہے وہ صرف رسوم ورواج ہی نہیں ہیں بلکہ یہ سنکر تمہیں تعجب ہوگا کہ انھیں تمہاری فقہ اور روایات کی سندات حاصل ہیں۔ کسی کا غصہ میں آکر طلاق۔ طلاق۔ طلاق کے ایک، دو، تین سے نیلام کنندہ کی طرح زندگی کی رفاقتوں کا مقدس رشتہ، اس طرح توڑ دینا اور اس کے بعد جب غصہ فرو ہو جائے تو پھر تمہاری خود ساختہ "شریعت" کا اس پر اصرار کہ بیوی کو ایک رات کے لئے کسی غیر مرد کے آغوشِ ہوس رانی میں دیکھنے کی بے حیائی کو گوارا کرنا ہوگا۔ اس قدر باعثِ ننگِ انسانیت اور وجۂ ذلت آدمیت ہے کہ دنیا کی کسی شریف سوسائٹی میں اس کا ذکر تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ہمارے ہاں اسے شریعتِ مقدسہ کے احکام قرار دے کر اسلامِ مظلوم کی مٹی پلید کی جاتی ہے اور جب کسی سے اس کے خلاف کچھ کہا جائے تو ملحد وبے دین کی گالیاں سننی پڑتی ہیں۔ دیر کی بات ہے۔ میں چھٹیوں میں گاؤں گیا ہوا تھا۔ چندا تیلی نے غصہ میں آکر اپنی بیوی سے "تین طلاق" کہدیا۔ تم اس کی بیوی کو جانتے ہو۔ بڑی نیک بخت۔ دودھ پوت، آل اولاد والی۔ سر کے بال تک سفید ہو رہے تھے۔ چندا خود بھی بڑا بھلا مانس آدمی تھا۔ بات گاؤں بھر میں پھیل گئی۔ غصہ اترا تو چندا سخت محجوب و پشیمان تھا۔ اس کے جوان لڑکے اور لڑکیاں، بہوئیں سب گھر میں تھیں۔ مولوی چراغ دین گھیرو کے والوں کے ہاں فتویٰ کے لئے گئے۔ انھوں نے کہدیا کہ طلاق بائن ہوگئی۔ اب حلالہ ضروری ہے۔ پوچھا کہ میاں جی حلالہ کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ چندا کی بیوی کو کسی دوسرے آدمی سے نکاح کرنا ہوگا اس شرط کے ساتھ کہ ایک شب کی ہمبستری کے بعد وہ اسے طلاق دیدیگا۔ اس کے بعد چندا پھر اپنی بیوی سے

نکاح کرسکتا ہے۔ چندا کے گھر میں اس سے کہرام مچ گیا۔ اس کے بیٹوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اپنی ماں کی اس بے عزتی کے تصور سے اس درجہ مشتعل ہوئے کہ انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ چندا کو مار ڈالیں گے۔ چندا بیچارا الگ شرم سے منہ چھپائے پھر رہا تھا۔ سب سے برا حال اس کی بیوی کا تھا۔ اس نے یہاں تک کہدیا کہ غصہ میں آکر قصور تو چندا نے کیا اور اس بڑھاپے میں مٹی میری خوار کی جا رہی ہے۔ یہ خدا کا حکم کیسا ہے؟ سلیم! یہ بات واقعی کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ خدا کا یہ حکم کیسا ہے! لیکن چونکہ مولوی چراغ دین نے کہدیا تھا کہ یہی خدا رسول کا حکم ہے اس لئے کس کی مجال تھی کہ اس سے انکار کرتا! اور مولوی چراغ دین بھی سچا تھا۔ اسے پڑھایا ہی گیا تھا۔ وہ بیچارا کیا کرتا!

سلیم! قرآن کے اعجاز پر غور کرو۔ جہاں اس میں سب سے پہلے طلاق کے احکام بیان ہوئے ہیں وہاں یہ ٹکڑا بھی موجود ہے کہ ولا تتخذوا آیات اللہ ھزوا (۲/۲۳۱) دیکھنا۔ احکام خداوندی کا مذاق نہ اڑانا! سوچو کہ ہمارے ہاں کس طرح احکام خداوندی کا مذاق اڑایا جا رہا ہے! قرآن میں، سلیم! جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، بہت تھوڑے احکام ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی دیدی گئی ہیں۔ باقی سب احکام بطور اصول مذکور ہیں۔ جن احکام کی جزئیات بھی قرآن ہی نے متعین کردی ہیں وہ بیشتر عائلی زندگی سے متعلق ہیں۔ اس سے تم اندازہ کرو کہ عائلی زندگی، انسانی نظامِ حیات میں کس قدر اہمیت رکھتی ہے! حقیقت یہ ہے کہ عائلی زندگی، چھوٹے پیمانے پر مملکتی نظام کا عکس ہے۔ گھر کیا ہے؟ ایک چھوٹی سی ریاست جس میں بزرگ خاندان حاکم اعلیٰ ہے۔ اس میں مجلس مشاورت بھی ہے اور مجلس عمل بھی۔ ذمہ داریاں بھی ہیں اور حقوق بھی۔ تادیب و تربیت بھی ہے اور نظم و ضبط بھی۔ یہ ریاست میاں بیوی کی باہمی رفاقت سے چلتی ہے جس کے لئے ان کا ہم آہنگ اور متحد الخیال ہونا لاینفک ہے۔ اگر ان میں وحدتِ خیال اور اشتراکِ عمل نہیں تو اس ریاست میں فساد برپا ہوجائے گا اور اس کے مضر عواقب ملت کی اجتماعی زندگی تک اثر انداز ہوں گے۔ لہٰذا نکاح نام ہے ان مشترکہ ذمہ داریوں کے سنبھالنے کا باہمی معاہدہ جس کی بنیاد تراضی مابین پر ہے۔ لیکن اگر حالات ایسے پیدا ہوجائیں کہ میاں بیوی میں بعض وجوہات کے باعث ہم آہنگیِ خیال و عمل نہ رہے اور اس عدم اشتراک و توافق کی وجہ سے عائلی زندگی کا نظام درہم برہم ہوجائے تو قرآن نے اس معاہدہ کے فسخ کردینے کی بھی اجازت دی ہے۔ اسے طلاق کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن نے جس معاہدہ کی توثیق پر اتنا زور دیا ہے اور اس کی ایفاء کی اس قدر اہمیت بتائی ہے وہ اس کی تنسیخ کو بچوں کا کھیل نہیں بنائے گا۔ اس کے لئے اس نے ایسی شرائط و حدود متعین کی ہیں کہ جب تک انھیں پورا نہ کیا جائے یہ معاہدہ فسخ نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے ان شرائط و قیود کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ ان تفاصیل پر غور کرنے سے سلیم! یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کا منشا یہ ہے کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے جس سے سفرِ زندگی کی رفاقت کا یہ معاہدہ ٹوٹنے نہ پائے۔ وہ انسانی فطرت کی کمزوریوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔

وہ جانتا ہے کہ انسان بعض اوقات شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر ایسا فیصلہ کر بیٹھتا ہے جس پر بعد میں خود ہی متاسف و پشیمان ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا وہ غلط فیصلہ ناطق نہ قرار پا جائے۔ قرآن نے اس کی رعایت رکھی ہے اور فیصلہ اور اس کے نفاذ میں اتنا وقفہ رکھا ہے کہ انسان خالی الذہن اور معرّیٰ عن الجذبات ہو کر ٹھنڈے دل سے اس فیصلہ پر نظرِ ثانی کر سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن اس توثیق و تنسیخ معاہدہ کو بازیچۂ اطفال بھی بنانا نہیں چاہتا کہ انسان عمر بھر یہی کھیل کھیلتا رہے۔ ان مبادیات کو سامنے رکھو اور پھر سلیم! قرآن کی حدود و شرائط پر غور کرو۔ بات واضح ہو جائے گی کہ قرآن کی رو سے طلاق کس طرح سے عمل میں آتی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، زندگی کی اس کشتی کو بخیر و خوبی ساحل تک لیجانے کے لئے میاں اور بیوی کی باہمی رفاقت اور اشتراکِ عمل ضروری ہے۔ لیکن اگر میاں اور بیوی کے تعلقات ایسی کشیدگی اختیار کر جائیں کہ بیوی رفاقت کی جگہ سرکشی پر اتر آئے تو پھر اس کی طرف خاص طور پر توجہ دینے کی ضرورت پڑ جائے گی۔ چنانچہ سورۂ نساء میں ہے کہ واللّٰتی تخافون نشوزھن (۳۴) "جن بیویوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو" تو ان کے متعلق کیا کرو؟ یہ نہیں کہ محض اس اندیشہ کی بناء پر (یا ان کی کسی حرکت سے غصہ میں آ کر) فوری تعلقات منقطع کر لو۔ بلکہ فعظوھن، انہیں نرمی اور محبت سے سمجھاؤ۔ اگر وہ اس پر بھی سرکشی سے باز نہ آئیں تو واھجروھن فی المضاجع، خوابگاہوں میں ان سے الگ رہنے لگو۔ ذرا غور کرو سلیم! اگر عورت نیک سرشت اور شریف النفس ہوگی تو اس کے لئے یہ تنبیہ بہت کافی ہوگی۔ لیکن اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ وہ اس پر بھی سرکشی سے نہ رکے تو اس کی بھی اجازت ہے کہ اس پر ذرا سختی کی جائے۔ (واضربوھن۔ تم انہیں مار بھی سکتے ہو) اس مقام پر تمہارے دل میں جو خیالات پیدا ہوں گے ان کا مجھے احساس ہے۔ تم یقیناً کہو گے کہ یہ تو بڑی بربریت ہے کہ عورتوں کو پیٹنا شروع کر دیا جائے۔ لیکن سلیم! اس سے مقصود وحشت اور بربریت کی مار پیٹ نہیں ہے۔ اس علاج کو قرآن کے دیگر احکام کی روشنی میں دیکھو جہاں عورتوں کے ساتھ ملاطفت اور حسنِ معاشرت کی تاکید آتی ہے۔ اس خط میں ان تفاصیل کی گنجائش نہیں۔ جب کبھی اس موضوع پر گفتگو ہوگی تو تم دیکھو گے کہ قرآن نے عورت کو کتنی بڑی حیثیت دی ہے۔ اس مقام پر صرف اتنا سمجھ لو کہ اس تنبیہی مار کی اجازت وہی چیز ہے جسے آجکل کی اصطلاح میں Parental Legislation کہتے ہیں اور جس کی رو سے، بچے کے ہاتھ سے چاقو چھیننے کے لئے اُسے تا دیباً تھپڑ مار دینا جائز ہوتا ہے۔ فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا "اگر وہ اس پر رو بہ اصلاح ہو جائیں اور تمہارا کہنا مان لیں تو پھر تم خواہ مخواہ الزام دینے کی راہیں دتلاش کرتے پھرو۔ یاد رکھو ان اللہ کان علیا کبیرا! اللہ سب کے اوپر اور سب سے بڑائی رکھنے والا ہے"

یہاں تک معاملہ نجی تھا۔ لیکن اگر اس پر بھی بات نہ بنے اور باہمی تعلقات کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے چلے جائیں تو پھر معاملہ اپنی ذات سے آگے بڑھ کر پنچایت اور عدالت تک پہنچانا ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد کا حکم جماعت (یعنی مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ) سے ہے جس میں فرمایا۔ وان خفتم شقاق بینھما۔ اگر تمہیں خدشہ ہو کہ میاں بیوی میں تفرقہ پڑ جائے گا تو وابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا۔ تو تمہیں چاہئے کہ ایک حکم شوہر کے کنبے سے مقرر کرو اور ایک بیوی کے کنبہ سے۔ ان یریدا اصلاحا یوفق اللہ بینھما۔ اگر یہ پنچ (دل سے) کوشش کریں گے کہ میاں بیوی میں صلح صفائی کرا دیں تو اللہ میاں بیوی میں موافقت کے سامان پیدا کر دے گا۔ لیکن اگر یہ حکم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ پانی سر سے گذر چکا ہے اور حالات اس درجہ کشیدگی اختیار کر چکے ہیں کہ میاں بیوی کی باہمی موافقت ناممکن ہے۔ تو اس کے بعد علیحدگی کی صورت پیش آئے گی۔ جسے طلاق کہتے ہیں۔

یہاں تک تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ طلاق تک پہنچنے کے لئے کن کن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہ شرائط طلاق کے مبادیات میں سے ہیں اور طلاق ہو نہیں سکتی جب تک پہلے ان شرائط کو پورا نہ کیا جائے۔ یعنی نرمی اور سختی سے نجی طور پر اصلاح حال کی کوشش اور اس کے بعد عدالت یا پنچایت کے ذریعے (جیسا بھی اسلامی آئین نے مقرر کر رکھا ہو) ثالثوں کی وساطت سے یہ فیصلہ کہ باہمی موافقت کی صورت نکل سکتی ہے یا طلاق کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہیں رہا۔ اگر فیصلہ یہ ہو کہ طلاق ناگزیر ہے تو اس کی صورت حسب ذیل ہوگی۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس فیصلہ کے بعد کہ طلاق ناگزیر ہے، طلاق کب دینی چاہئے۔ سورۂ طلاق میں ہے۔

یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن۔۔۔ (۶۵/۱) اے نبی۔

جب تم (لوگ) عورتوں کو طلاق دو تو انہیں عدت کی مدت پورا کرنے کے لئے طلاق دو۔

یہاں سے ظاہر ہے کہ طلاق ایسے وقت میں دینی چاہئے جہاں سے عدت کا شمار ہو سکے۔ (عدت کسے کہتے ہیں اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آتا ہے) عدت کس قدر ہے اس کے متعلق فرمایا۔

(۱) والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلثۃ قروء (۲/۲۲۸) اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔

(۲) والئی یئسن من المحیض من نسآئکم ان ارتبتم فعدتھن ثلثۃ اشھر والئی لم یحضن (۶۵/۴) اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تمہیں شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں حیض نہ آتا ہو۔

(۳) واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن۔ (۶۵/۴) اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔

لیکن عدت

(۱) ان عورتوں کے لئے جنہیں حیض آتا ہو، تین حیض کا زمانہ
(۲) جنہیں حیض نہ آسکتا ہو (بوجہ کبر سنی یا بیماری) تین ماہ، اور
(۳) حاملہ کے لئے وضع حمل تک کا زمانہ۔

صورتِ اول میں ظاہر ہے کہ چونکہ عدت کا زمانہ ماہواری ایام کے شمار سے ہوگا، اس لئے عدت کی ابتداء حیض کے بعد سے ہوگی۔ اگر عدت، حیض سے پہلے یا دورانِ حیض میں شروع ہوگئی (اور اگر وہ حیض گنتی میں لے لیا تو) تین حیض کا زمانہ، تین ماہ سے بہت کم رہ جائے گا اور (اگر وہ حیض شمار نہ کیا تو) ایام عدت میں چار حیض ہو جائیں گے۔ اس لئے اس کی صحیح صورت یہی ہے کہ عدت کا شمار حیض کے فوری بعد سے شروع ہو۔ لہذا حائضہ کی صورت میں طلاق، حیض کے بعد حالت طہر میں دی جائے گی۔ اس میں علاوہ دیگر مصالح کے، ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اگر اس دوران میں حمل قرار پاگیا ہے تو اس کا علم ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ طبائع میں تبدیلی پیدا کرنے کا موجب بن جائے اور طلاق کا فیصلہ ٹال دیا جائے اور اس کے بعد بچہ ہونے کی صورت میں، ایک نئی ازدواجی زندگی کی خوشگواری تعلقات میں موافقت پیدا کر دے۔ دیکھو سلیم! قرآن نے کس طرح چلتے چلتے بھی ایک ممکن الوقوع تبدیلی سے کس طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ اس کا مقصد اتصال ہے، انقطاع نہیں۔ ملاپ ہے، تفرقہ نہیں۔

لہذا، حائضہ کی صورت میں طلاق کا وقت، بعد حیض بحالتِ طہر ہے۔ البتہ دوسری صورتوں میں یہ شرط نہیں عائد کی جاسکتی۔

چنانچہ، جب دل کے پورے سکون اور دماغ کے کامل ہوش کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ تعلقات کسی صورت میں بھی نبھ نہیں سکتے تو معاہدۂ نکاح کے کالعدم کر دینے کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اسے طلاق کہتے ہیں بس یہ طلاق ہوگئی۔ خواہ ایک مرتبہ کہئے، خواہ سو مرتبہ۔ یہ طلاق ہے۔ اس کے بعد نکاح ختم ہوگیا۔ میاں بیوی عقد کی بندشوں سے آزاد ہوگئے کہ طلاق کے معنی ہی بندش سے آزاد ہو جانے کے ہیں۔ رجعی، بدعی، بائن وغیرہ طلاق کی قسمیں سب ہماری پیدا کردہ ہیں۔ قرآن میں طلاق کی ایک ہی قسم ہے جس طرح نکاح کی ایک قسم ہے۔ معاہدہ یا قائم ہوتا ہے یا فسخ ہو جاتا ہے۔ ان کے بین بین کوئی اور شکل نہیں ہوتی۔ اب اس عورت کے ساتھ اس مرد کا نکاح باقی نہیں رہا۔

اب کیا ہوگا؟ اب عدت کا زمانہ شروع ہوگیا۔ تم پوچھو گے کہ عدت کیا ہوتی ہے؟ عدت اس مدت کو کہتے ہیں جس میں یہ مطلقہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کر سکتی۔ لیکن یہی (سابقہ) میاں بیوی پھر چاہیں تو اس دوران میں باہمی نکاح کر سکتے ہیں۔ یہ بالکل اسی قسم کا نکاح ہوگا جیسا عام حالات میں نکاح ہوتا ہے۔ انہی شرائط و قیود کے ساتھ جو قرآن نے نکاح کے لئے مقرر کی ہیں (ان کی تفصیل، سلیم! اس وقت بتاؤں گا جب تم اپنی غزل کو مطلع سے شروع کرو گے) تم نے دیکھا سلیم! قرآن انسانی فطرت کی

کس قدر رعایت رکھتا ہے۔ یہ عدت کا وقفہ کیسا عجیب مہلت کا وقفہ ہے جس میں ایک دوسرے سے الگ ہو کر اس نئی زندگی کے تجربات سامنے آجاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہی تجربات انہیں وابستگی تعلقات پہ پھر آمادہ کر دیں اور ان کا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جڑ جائے۔ اسی لئے فرمایا کہ وبعولتھن احق بردھن فی ذالک ان ارادوا اصلاحا (۲۲۸/۲) "اس (زمانۂ عدت) میں ان کے خاوند انہیں واپس لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں بشرطیکہ وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں" لیکن اگر اس زمانۂ عدت میں بھی انھوں نے تجدید نکاح نہ کی تو اس کے بعد عورت آزاد ہوگی کہ چاہے اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کرلے، چاہے کسی اور سے۔ اس آخری منزلِ انقطاعِ تعلقات کے وقت بھی دو گواہوں کی موجودگی کی ضرورت ہے۔ تاکہ یہ بات چھپی نہ رہے کہ عورت اب جدید نکاح کے لئے آزاد ہے (واشھدوا ذوی عدل منکم (۲/۶۵))

اگر اس میاں بیوی نے عدت کے دوران میں، یا اس کے بعد، باہمی نکاح کرلیا تو انھوں نے اپنی ازدواجی زندگی میں طلاق کے ایک (Avail Chance) کو (کرلیا۔ (ان الفاظ سے سلیم! تم مفہوم کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکو گے) اب اگر ان کی نئی زندگی میں، پھر وہی حالات رونما ہوگئے تو پھر اس طریق کے مطابق جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، باہمی طلاق ہو سکتی ہے۔ اس طلاق کے بعد بھی یہ امکان باقی رہتا ہے کہ عدت کے زمانہ میں یا اس کے بعد، یہ پھر باہمی تجدید نکاح سے ازدواجی رشتہ استوار کرلیں۔ اگر انہوں نے دوسری مرتبہ کی طلاق کے بعد پھر نکاح کرلیا تو ان کے دو (Chances) ختم ہوگئے۔

> الطلاق مرتن فامساک بمعروف او تسریح باحسان (۲۲۹/۲) طلاق دو مرتبہ (ایسی ہوتی ہے کہ جس میں) چاہے بطریق معروف اس عورت کو رکھ لیا جائے یا پھر حسن سلوک سے اسے رخصت کر دیا جائے۔

اب دوسری مرتبہ کی طلاق (اور تیسری مرتبہ کے نکاح) کے بعد انہیں (Warn) کر دیا جاتا ہے کہ یہ کھیلا بار بار نہیں رچائی جا سکتی۔ زندگی، مذاق نہیں، سنجیدہ حقیقت کا نام ہے۔ اب بھلے مانسوں کی طرح زندگی کی کشتی کو کنارے تک لے جاؤ۔ اگر اس مرتبہ بھی تم نے آپس میں نباہ کی صورت پیدا نہ کی اور پھر رشتہ مناکحت کو منقطع کرلیا۔ تو یاد رکھو اس تیسری بار کی طلاق کے بعد، یہ عورت تمہارے نکاح میں نہیں آسکے گی نہ دوران عدت میں، نہ اس کے بعد۔ اس لئے اب کے جو فیصلہ کرو تو ذرا سوچ سمجھ کر کرنا۔

> فان طلقھا فلا تحل لہ من بعد (۲۳۰/۲) اگر تیسری بار طلاق دیدی تو پھر یہ عورت اس مرد کے لئے جائز نہیں رہے گی۔

یہ ہوگئی تیسری طلاق۔ اس جوڑے نے اپنی ازدواجی زندگی میں وصل و فصل کے سب (Chances) یعنی تینوں مواقع (Avail) کرلئے۔

اب یہاں سلیم! سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا یہ عورت اس مرد کے لئے ابدالآباد تک حرام ہو گئی؟ قرآن کہتا ہے کہ ایسا نہیں۔ اگر اس عورت نے کسی اور مرد سے نکاح کر لیا اور وہ نکاح بھی کامیاب ثابت ہوا اور نوبت طلاق تک آگئی (اسی طرح طلاق جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) تو اگر وہ عورت زمانہ عدت کے بعد، اس پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو اس کی اجازت ہے۔ اوپر کی آیت یوں مکمل ہوتی ہے فلاتحل لہٗ من بعد حتیٰ تنکح زوجاً غیرہ۔ فان طلقھا فلاجناح علیھما ان یتراجعا ان یقیما حدود اللہ (۲/۲۳۰) "تیسری طلاق کے بعد یہ عورت اس خاوند کے لئے جائز نہیں ہوگی۔ ہاں مگر اگر وہ کسی اور مرد سے نکاح کر لے اور وہ اسے طلاق دیدے۔ تو اس صورت میں ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے کی طرف پھر رجوع کر لیں بشرطیکہ انھیں یقین ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھیں گے"۔

یہ ہے سلیم! وہ آیۂ مقدسہ جس سے حلالہ کا مسئلہ وضع کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے تو طلاق کی یوں ہنسی اڑائی کہ جونہی کسی شخص نے غصہ میں آکر کہہ دیا تین طلاق (یا طلاق۔ طلاق۔ طلاق) تو یہ وہ طلاق ہو گئی جس کے بعد یہ عورت اس وقت تک اپنے خاوند کے لئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک وہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کرے۔ پہلے تو احکام خداوندی کے استہزاء سے یہ مصیبت اپنے گلے ڈال لی۔ پھر مصیبت کا گلے حل تلاش کرنے۔ اب حل یوں ڈھونڈھا گیا کہ کسی شخص کو تیار کیا جائے کہ وہ اس عورت سے ایک رات کے لئے شادی کرلے اور ایک شب کی ہمبستری کے بعد اسے دوسری صبح طلاق دیدے۔ اس کے بعد یہ عورت اپنے پہلے خاوند سے نکاح کر لے۔ سلیم سوچا کہ دنیا کی کسی قوم میں اس سے بڑھ کر شرمناک حرکت بھی ہو سکتی ہے! کیا اس نکاح کو نکاح کہا جا سکتا ہے؟ یہ نکاح کا مذاق ہے۔ یہ کھلی ہوئی حرامکاری ہے۔ یہ خدا کے احکام سے استہزاء ہے۔ اور خدا کے احکام سے کیا خود اپنی ذات سے استہزاء ہے۔ تم حیران ہو گے کہ اس بدبخت قوم میں پیشہ ور حلالہ کرنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ کس کس قسم کی شرائط نہ منواتے ہوں گے؟ سلیم! مجھے تو تم سے یہ باتیں کرتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن جب تم نے بات پوچھی ہے تو مجھے بتانا ہی پڑے گی اور تمہیں بھی یہ بے حیائی کے تذکرے سننے ہی پڑیں گے۔ اور ابھی تو میں نے تمہیں حلالہ کی تفصیلات نہیں بتائیں۔ وہ نہ میں بتا سکوں گا۔ نہ تم سن سکو گے۔

بہرحال سلیم! یہ ہے قرآن کی رو سے طلاق۔ اچھا ہوا تم نے بات پوچھ لی اور یوں اس باب میں قرآنی احکام سامنے آگئے۔ تم دیکھو گے کہ اس بارے میں مسلمان کس قدر جہالت میں گھرے ہوئے ہیں۔ جہاں تک میں نے دیکھا ہے، قرآن کے مطابق طلاق مجھے کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ کہیں ایک ہی مرتبہ ایک۔ دو۔ تین سے تینوں طلاقیں پوری کر دی جاتی ہیں اور کہیں تین مہینوں (عدت کے زمانہ) میں ایک ایک ماہ کے بعد تین طلاقیں مکمل ہو جاتی ہیں۔ یہ فقہ اور روایات کی طلاق ہے، قرآن کی نہیں۔ اور قرآن کا مسلمانوں کے ہاں باقی ہی کیا ہے؟ یہ تو خدا کا احسان ہے (اور اس لئے کہ اس نے دین کو مکمل

کردیا ہے) کہ قرآن اپنی اصل شکل میں ہمارے ہاں موجود ہے جس کی وجہ سے اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ ہم دیکھ سکیں کہ ہمارا کون کون سا عمل، قرآن کے مطابق اور کون کون سا کام اس کے خلاف ہے۔ ورنہ کوئی صورت ہی نہ تھی کہ ہم آج یہ معلوم کرسکتے کہ اسلام کی صحیح شکل کیا تھی۔ قرآن اپنی اصل شکل میں محفوظ نہ ہوتا تو آج نہ میں یہ کچھ بتا سکتا نہ تم سن سکتے۔

گر عشق نہ بودے و غمِ عشق نہ بودے ۔۔۔ اینہا سخنِ نغز کہ گفتے، کہ شنودے

باقی مذاہب کے ساتھ یہی ہوا ہے کہ ان کی آسمانی کتابیں اپنی اصل شکل میں کہیں موجود نہ رہیں۔ اس لئے وہ آج اس قابل ہی نہیں کہ یہ بتا سکیں کہ وہ کہاں کہاں غلطی کر گئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ وہ مذہب کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ بہرحال یہ داستان الگ ہے۔ جو بات تم نے پوچھی وہ اوپر آچکی ہے۔

ایک بات طلیم! اور رہ گئی۔ اوپر کے احکام سے یوں مترشح ہوتا ہے گویا طلاق کا حق صرف مرد کو دیا گیا ہے اور عورت بیچاری مجبور ہے کہ جو فیصلہ وہ کرے اسے تسلیم کرلے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ قرآن نے احکام کو اس شکل میں بیان کرنے کے ساتھ ہی فرمایا کہ ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (۲/۲۲۸) "عورتوں کے لئے بھی اسی طرح کے حقوق مردوں پر ہیں جس طرح کے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں"۔ یہ ایک ایسا کلیہ اور اصولِ جامع بیان کردیا گیا ہے جس کے اندر وہ تمام تفاصیل سمٹ کر آگئی ہیں جو نکاح و طلاق کے متعلق مردوں کو مخاطب کرکے قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جن حالات کے ماتحت، جن جن شرائط کے مطابق، ایک خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے، انہی حالات و شرائط کے مطابق، ایک عورت اپنے خاوند سے طلاق لے سکتی ہے۔ جب معاہدۂ نکاح میں عورت کو رد و قبول کا پورا پورا حق ہے تو اس معاہدہ کی تنسیخ میں اسے کیوں حق نہیں ہے۔ طلاق کی صورت میں مرد سے کہا گیا ہے کہ مہر و متاع کی ہر شے عورت کو دینی ہوگی۔ لیکن مرد کا چونکہ کوئی مہر نہیں ہوتا، اس لئے اس کے بدلے میں عورت سے کہا گیا کہ اسے طلاق کے لئے اپنے حق میں سے کچھ چھوڑنا ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض امورِ زندگی میں قرآن نے مردوں کی افضلیت کو تسلیم کیا ہے۔ (وللرجال علیھن درجۃ۔ ۲/۲۲۸) لیکن امورِ نکاح و طلاق وغیرہ میں عورت کو وہی حقوق حاصل ہیں جو مردوں کو حاصل ہیں۔ اس اصول کے ماتحت جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے (کہ عورتوں کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے) اسلامی نظامِ حکومت، ایسی تفاصیل مرتب کرسکتا ہے، جن کی رو سے وہ تمام شرائط (Mutatis Mutandis.) متعین ہوجائیں۔ جن کے رو سے ایک عورت، مرد کو طلاق دے سکتی ہے۔

اب تمہاری آخری بات باقی رہ گئی کہ اگر ایک شخص غصہ کی حالت میں ایسے الفاظ کہہ دے یا قسم کھالے

جس سے میاں بیوی کے تعلقات زناشوئی میں فرق آجاتا ہو تو اس کے متعلق کیا کیا جائے۔ قرآن میں ہے

لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم۔ واللہ غفور حلیم (۲/۲۲۵) تمہاری قسموں میں جو لغو اور بے معنی ہوں گی ان پر اللہ پکڑ نہیں کریگا۔ جو کچھ بھی پکڑ ہوگی تو وہ اس بات پر ہوگی جو (تم نے سمجھ بوجھ کر کی ہے اور اس لئے) تمہارے دلوں نے (اپنے قصد و ارادہ سے) کمائی ہے۔

یعنی جو قسم بلا قصد و ارادہ کھالی جائے اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ یہ لغویت ضرور ہے جس سے اجتناب کرنے کا حکم قرآن میں آیا ہے۔ باقی رہیں وہ قسمیں جو دل کے ارادہ سے کھائی ہوں لیکن بعد میں انسان ان پر متاسف ہو اور چاہے کہ ان سے رجوع کرے۔ تو ان کے متعلق دوسری جگہ کفارہ کا حکم ہے۔ یعنی کچھ تاوان دے کر اپنی حماقت کا خمیازہ بھگتے۔ (دیکھو ۵/۸۹) لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی سے (مثلاً) مقاربت کے بارے میں قسم کھائے اور اس کے بعد اس پر نادم و متاسف بھی نہ ہو۔ تو اس سے بیوی معلق حالت میں رہ جائے گی۔ اس حالت کو غیر معین عرصہ تک کے لئے روا نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لئے فرمایا کہ

للذین یؤلون من نسائھم تربص اربعۃ اشھر۔ فان فآءو فان اللہ غفور الرحیم وان عزموا الطلاق فان اللہ سمیع علیم۔ (۲/۲۲۶-۲۲۷) جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے کی قسم کھالیں تو ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ پھر اگر وہ اس مدت کے اندر رجوع کرلیں تو اللہ رحمت سے بخشنے والا ہے۔ لیکن اگر (نباہ نہ ہو سکے اور) وہ طلاق کی ٹھان لیں تو (یہ سمجھ رکھو کہ) اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

یعنی ایسی صورت میں چار ماہ کے اندر فیصلہ کرنا ہوگا کہ تمہارا باہمی نباہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر تم اپنے کیئے پر پچھتاؤ، تو قسم کا کفارہ ادا کرکے باہمی ملاپ کرلو۔ لیکن اگر معاملہ اس سے آگے بڑھ گیا ہو اور ملاپ کی صورت نظر نہ آتی ہو تو پھر وہ تمام شرائط پوری کرکے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، اپنے ازدواجی معاہدہ کو ختم کردو۔

اس چیز پر بھی تم نے سلیم! غور کیا ہوگا کہ قرآن نے وجوہِ طلاق کو متعین نہیں کیا۔ عیسائیت (انجیل) صرف زنا کی صورت میں طلاق کی اجازت دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میاں بیوی خواہ کسی وجہ سے الگ ہونا چاہیں، انہیں زنا ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ صورتِ حالات جس قدر خرابیوں کا موجب بن سکتی ہے، ظاہر ہے۔ انہی دقتوں کی بنا پر اب عیسائی حکومتوں نے طلاق کے مذہبی قانون کو چھوڑ کر "دنیاوی قانون" الگ بنالئے ہیں۔ لیکن ان میں بھی وہ حدود و شرائط نہیں جو قرآن نے متعین کی ہیں — دوسری طرف ہندوؤں کو لیجئے تو ان کے ہاں مذہباً طلاق جائز ہی نہیں۔ اس لئے اب انہیں بھی اپنے مذہب کو چھوڑ کر طلاق کے لئے الگ راہیں تلاش کرنی پڑ رہی ہیں۔ تیسری طرف مسلمانوں کو دیکھئے کہ انہیں ان کی

خدا کی طرف سے ایسے عمدہ احکام ملے ہیں لیکن انھوں نے فقہ اور غلط روایات کے انسان ساز قوانین اختیار کرکے اپنے آپ کو خود جہنم میں ڈال رکھا ہے۔ ان سب خرابیوں کا علاج سلیم! ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم تمام دوسرے قوانین و رسوم سے منہ موڑ کر صرف اس قانون کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنائیں جو خدائے احکم الحاکمین نے ہمارے لئے متعین کیا ہے اور یہی اصل دین ہے۔

جاتے جاتے تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سناؤں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ایک مرتبہ ہندوستان کی اسمبلی میں ایک مسودہ قانون پیش ہوا تھا جسے ساردا بل کہتے تھے اور جس کی رو سے نابالغان کی شادی ممنوع قرار دی جاتی تھی۔ یہ بل ایک ہندو کی طرف سے پیش ہوا تھا جن کی مقدس مذہبی کتابوں میں نابالغان کی شادی کی اجازت ہی نہیں بلکہ اسے مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ سن کر سلیم! تمہاری حیرت کی انتہا نہ رہے گی کہ اس بل کی مخالفت مسلمانوں کی طرف سے بھی ہوئی تھی۔ اور شدید مخالفت۔ میں نے دیکھا کہ اس موقعہ پر مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں کے نمائندے اس مسئلہ پر متحد ہو گئے تھے۔ (کس قدر بوالعجبی ہے کہ ان فرقوں کا حق پر کبھی اتحاد و اجماع نہیں ہوتا۔ اور اگر کبھی یہ باہمی متفق ہوئے تو اس مسئلہ پر کہ بچوں کی شادی کو جائز قرار دیا جائے) چنانچہ ان کے ایک عظیم وفد نے وائسرائے کے ہاں شرف باریابی بھی حاصل کیا تھا۔ کس قدر حسرتناک تھا سلیم! یہ منظر کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نمائندے (یعنی حضرات علمائے کرام) ایک غیر مسلم حاکم سے استدعا کر رہے ہیں کہ وہ نابالغوں کی شادی کو ناجائز قرار نہ دے کیونکہ یہ مداخلت فی الدین ہوگی۔ ہر قلب حساس کی آنکھ اس منظر پر خون فشاں تھی۔ بعض حضرات نے جو فرقہ پرستی کی لعنت میں گرفتار نہ تھے دریافت کیا کہ نابالغ کے نکاح کے جواز میں کوئی قرآنی سند بھی موجود ہے۔ جواب ملا کہ ہاں موجود ہے۔ سلیم تم حیران ہوگے کہ نابالغوں کے نکاح کے جواز میں قرآنی سند کیسے مل سکتی ہے؟ نکاح تو ایک بہت بڑا اور اہم معاہدہ ہے اور بچوں کا معاہدہ کیسا؟ لیکن سنو کہ وہ سند کیا تھی۔ عدت کے ضمن میں تم نے دیکھا ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے :-

والّٰئی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتھن ثلٰثۃ اشھر والّٰئی لم یحضن۔ (۶۵/۴) اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تمہیں شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اور ان کی بھی جنہیں حیض نہ آسکتا ہو۔

انھوں نے کہا کہ سند یہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ جن عورتوں کو حیض نہ آیا ہو۔ (لم یحضن) ان کی عدت تین ماہ ہے۔ وہ عورتیں جنہیں حیض نہ آیا ہو" نابالغ لڑکیاں ہی ہوسکتی ہیں۔ سو جب ان کی عدت کا ذکر ہے تو ان کا نکاح بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن قرآن نے سلیم! "لم یحضن" فرمایا ہے جس کے معنی "حیض نہ آیا ہو" نہیں، بلکہ یہ کہ "جنہیں حیض نہ آسکا ہو" یعنی بیماری کی وجہ سے یا کسی جسمانی نقص کے باعث (Constitutionally) حیض نہ آسکے۔ اور اگر سلیم! بالغرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ قرآن نے نابالغ لڑکی کی عدت بیان کی ہے

تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ نابالغ لڑکی کی شادی کی اجازت بھی دیتا ہے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ مفہوم ہو گا کہ اگر ایسی صورت سامنے آجائے جس میں کسی نے نابالغ لڑکی سے شادی کرلی ہو تو اس میں عدت یوں گنی جائیگی جیسے قرآن میں ہے کہ جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز نہ پڑھو۔ تو اس سے یہ نہیں ثابت ہو جاتا کہ قرآن شراب کی اجازت دیتا ہے، شراب ممنوع ہے لیکن قرآن نے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی شخص اس امر ممنوع کا ارتکاب کرلے تو اس کے لئے نماز کا یہ حکم ہے۔

بہرحال سلیم! یہ تو ایک ضمنی گوشہ تھا۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث کبھی پھر سہی۔ اس وقت تم نے طلاق کے متعلق پوچھا تھا۔ سو میرا خیال ہے کہ قرآن کی رو سے طلاق کے احکام واضح ہو گئے ہوں گے مختصراً پھر سن لو کہ اس کے لئے حسب ذیل شرائط لاینفک ہیں۔

(۱) میاں بیوی کے اختلاف کی صورت میں

(الف) باہمی افہام و تفہیم کی ہر ممکن کوشش۔ نرمی اور سختی سے۔

(ب) اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو عدالت (یا پنچایت) کی طرف سے دو ثالثوں کا تقرر۔ اگر ثالث بھی اس میں کامیاب نہ ہوں تو پھر عدالت کی رو سے فیصلہ، کہ طلاق کے بغیر اور کوئی چارہ کار نہیں۔

(۲) طلاق، حیض کے بعد، حالتِ طہر میں دی جائے گی۔

(۳) اس فیصلہ کے بعد نکاح کا معاہدہ ختم ہو جائے گا اور عدت کا زمانہ شروع۔

(۴) زمانۂ عدت میں عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکے گی۔ لیکن اگر یہ (سابقہ) میاں بیوی رضامند ہوں تو آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔

(۵) عدت کے بعد، عورت آزاد ہے کہ جس مرد سے جی چاہے شادی کرلے۔ خواہ اپنے پہلے خاوند سے یا کسی اور سے۔ پہلے خاوند سے بھی نکاح پوری شرائط کے ساتھ ہو گا۔

(۶) اس دوسرے نکاح کے بعد ان کی نئی ازدواجی زندگی شروع ہو گی۔

(۷) اگر پھر طلاق کی نوبت آجائے تو زمانۂ عدت میں، یا اس کے بعد بھی میاں بیوی دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ اب یہ دو مرتبہ کی طلاق ہو گئی۔

(۸) اس نکاح کے بعد اگر پھر طلاق کی نوبت آجائے (جو تیسری مرتبہ کی طلاق ہے) تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں شادی نہیں کر سکتے۔ نہ زمانۂ عدت میں نہ عدت کے بعد۔

(۹) البتہ اگر اس عورت کو اس کے نئے خاوند سے، انہی شرائط کے مطابق جو اوپر درج کی جا چکی ہیں، طلاق مل جائے، تو پھر اس میں کوئی ہرج نہیں کہ یہ عورت اپنے پہلے خاوند سے شادی کرلے۔

(۱۰) طلاق کے متعلق جو حقوق و فرائض مرد کے ہیں بعینہٖ وہی عورت کے ہیں۔ عورت بھی اسی طرح مرد کے حلقۂ تزویج سے آزاد ہو سکتی ہے جس طرح مرد معاہدۂ نکاح کو فسخ کر سکتا ہے۔ لیکن نہ یہ جس طرح جی میں آئے کر سکتا ہے نہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔ اُسے بھی قرآنی شرائط و حدود کے مطابق طلاق حاصل کرنی ہوگی اور اسے بھی۔

سمجھ گئے سلیم! یہ ہے قرآنی طلاق جسے تم تو مان لوگے لیکن کوئی مُلّا نہیں مانے گا۔ اس لئے کہ ان کا مذہب خدا کی طرف سے نازل شدہ نہیں ہے۔ جو انسانوں کے بنائے ہوئے مذہب کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور کہتے یہی ہیں کہ یہ منزل من اللہ ہے۔ یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ

والسلام

پرویز

نقد و نظر

ماہنامہ ہمایوں لاہور

ہندوستان (اور اب پاکستان) کے صاحب ذوق طبقہ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ہمایوں کے نام سے بے خبر ہو۔ لیکن ان میں ایسا بھی کوئی شاید ہی ہو جو اسے باور کرنے پر آمادہ ہو کہ ہمایوں میں تبدیلیٔ مسلک کے امکانات بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس اعلان کے بعد جو "نئے ارادوں" کے عنوان سے ہمایوں میں شائع ہوا ہے اسے باور کرنا ہی ہوگا کہ اس انقلاب آفریں زمانہ میں یہ بھی ممکن ہے۔ ہمیں اس سے بڑی خوشی ہوئی (اور ہم اس پر محترم میاں بشیر احمد صاحب کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں) کہ انہوں نے بالآخر یہ محسوس کر ہی لیا کہ زندگی کی گاڑی کے لئے تنہا موبل آئل ہی کافی نہیں ہوتا، اس میں پٹرول کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ موبل آئل تو صرف اس یبوست کو رفع کرنے کیلئے ہوتا ہے جو پرزوں کی باہم حرکت اور حرارت سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمایوں اپنی ادبی متانت اور سنجیدگی کے اعتبار سے اپنے مدیر کی فطرت سلیم و خاموش کا آئینہ دار رہا ہے۔ لیکن اس کی انجمن آرائی بہر کیف بر لب ساحل تھی جہاں (ترجمان حقیقت کے الفاظ میں) نوائے زندگانی، نرم خیز ہوتی ہے۔ اب اس کے "نئے ارادے" کشمکش زندگی کی تلاطم انگیزیوں سے نبرد آزمائی میں "حیات جاوداں" کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ ہم ان نئے ارادوں کا دل سے استقبال کرتے ہوئے متوقع ہیں کہ اس نئے میدان میں بھی ہمایوں اپنی روایتی متانت اور سنجیدگی سے "اضطراب موج" اور "سکون گہر" کے حسین امتزاج کی قابل تقلید مثال پیش کرے گا کہ

از تنک جامی او خوشتر نقش کار بیہودہ لیانہ نیست

بابُ المراسلات

(۱) ایصالِ ثواب قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

"یہ جو ہمارے ہاں رواج ہے کہ کسی کے مرنے کے بعد کھانے پکوا کر یا قرآن پڑھ کر اس کا ثواب مُردہ کو پہنچاتے ہیں، تو کیا یہ ثواب واقعی مردہ تک پہنچ جاتا ہے؟ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ اس کی دینی حیثیت کیا ہے؟"

طلوعِ اسلام "ایصالِ ثواب" کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ ضروری ہے کہ ثواب کا صحیح مفہوم متعین کر لیا جائے۔ اس لئے کہ جب تک یہ متعین نہ ہو کہ ثواب کہتے کسے ہیں اور یہ ہوتا کیا ہے، اس وقت تک یہ سمجھ میں نہیں آسکے گا کہ ایک کا ثواب دوسرے تک پہنچ سکتا ہے یا نہیں۔

اگر کوئی پوچھے کہ قرآن کا پیغام کیا ہے، اسلام کی تعلیم کا منشا و مفہوم کیا ہے۔ تو دو لفظوں میں اس کا جواب یہ ہے کہ اس تمام تعلیم کا مقصود و مفہوم ہے، "مکافاتِ عمل"۔ قرآن کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے آپ دیکھیں گے کہ اس کی ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کناں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کائنات کا یہ محیر العقول سلسلہ صرف اس اصلِ اصول پر قائم ہے کہ یہاں ہر حرکت ایک متعینہ نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ وہ عالمِ آفاق کے اس محسوس و مشہود نظام اور نظام کی علت سے اس حقیقت پر شہادت لاتا ہے کہ عالمِ انفس (دنیائے انسانیت) میں بھی یہی اصول جاری و ساری ہے۔ یعنی انسان کی کوئی حرکت، دل کا ارادہ اور نگاہ کی جنبش تک، بلا نتیجہ نہیں رہ سکتی اور ہر حرکت و عمل کا نتیجہ متعین ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ خدا۔ ملائکہ۔ رسالت۔ آخرت، پر ایمان کا تقاضا بھی اسی اصل الاصول پر یقین محکم کے لئے ہے کہ انسان کی کوئی حرکت بلا نتیجہ نہیں رہ سکتی۔ خدا مالک یوم الدین ہے۔ دین کے معنی مکافاتِ عمل کے ہیں۔ ملائکہ، عالمِ امر کی وہ تدبیری قوتیں ہیں جو ہر عمل کو اس کے نتیجہ تک پہنچانے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ رسول، اس پیغامِ ازلی کو انسانوں تک پہنچانے کا واسطہ ہے کہ ان کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ کتاب وہ محک اور میزان ہے جس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ انسان کے فلاں عمل کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور یوم الدین، اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت۔ یہی قرآن کی تعلیم ہے۔ اسی کے

مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

اسلام سے پہلے، مختلف مذاہب چونکہ اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہے تھے اس لئے ان کے ہاں مکافاتِ عمل کا تصور بھی بڑا غلط اور گمراہ کن ہو چکا تھا۔ یہودیت میں خدا کا تصور ایک شاہنشاہ کا تھا جو اگر خوش ہو جاتا تھا تو اپنی بخشائش و نوازشات کے دریا بہا دیتا تھا اور اسے غصہ آجاتا تھا تو تباہ و برباد کر دیتا تھا۔ عیسائیت دوسری طرف نکل گئی اور اس نے یہ عقیدہ پیدا کر لیا کہ تمام انسان، آدم کے جرم کی وجہ سے پیدائشی طور پر گناہگار پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے گناہوں کا کفارہ، خدا کے اکلوتے بیٹے نے اپنی جان سے دیدیا۔ اس طرح انسانوں کی نجات ہو گئی۔ فدیہ یا کفارہ کا یہی تصور ہمیں قدیم ایرانیوں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ جہاں سے یہ عقیدہ براہمنوں میں آیا اور قریب قریب سارا مشرق اس سے متاثر ہو گیا۔ اس لئے کہ یہ بے عملوں کے لئے فریبِ نفس کا نہایت کامیاب حیلہ تھا۔ اسلام آیا تو اس نے ان تمام باطل تصورات کو یک قلم مٹا دیا اور ان کی جگہ مکافاتِ عمل کا وہ تصور جو عین فطرت اور بصیرت کے مطابق تھا انسانوں کو عطا کر دیا۔

یہ فطرت اور بصیرت کے مطابق تصور وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی یہ کہ جو شخص کوئی کام کرتا ہے، اس کام کا ایک نتیجہ ہوتا ہے، اور وہ نتیجہ اس شخص کی فطرت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس اصول کو طبیعاتی دنیا میں دیکھئے کہ کس طرح کارفرما ہے۔ آگ کا کام جلانا ہے۔ ایک شخص آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ اس کی اس حرکت کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا ہاتھ جل جاتا ہے جس سے اسے تکلیف پہنچتی ہے۔ ایک دوائی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ وہ جلے ہوئے کو اچھا کر دیتی ہے۔ وہ اس دوائی کو لگاتا ہے اور اس سے اچھا ہو جاتا ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ آگ میں وہ اپنا ہاتھ ڈالے اور جل جائے میرا ہاتھ؟ یا یہ کہ دوائی میں اپنے ہاتھ پر لگاؤں اور اچھا ہو جائے اس کا زخم؟

ایک شخص سنکھیا کھا جاتا ہے جس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سنکھیا وہ کھائے اور ہلاک میں ہو جاؤں۔

سنکھیا کا اثر زائل کرنے کے لئے گھی اور دودھ کا استعمال کرایا جاتا ہے؟ کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ سنکھیا زید نے کھایا ہو اور دودھ اور گھی بکر کو پلایا جائے اور زید سے سنکھیا کی سمیت کا اثر زائل ہو جائے۔

صبح کی سیر صحت کے لئے بہت مفید ہے۔ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ آپ صبح دو چار میل کی سیر کر آئیں درانحالیکہ میں ہنوز بستر میں پڑا ہوں اور آپ اپنی سیر کے اثرات کو میری طرف منتقل کر دیں؟ یہ ناممکن ہے۔ یہ خلاف فطرت ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ سیر کے جو اثرات آپ کے جسمانی حالت پر مرتب ہو رہے ہیں آپ انہیں کسی طرح مجھ تک منتقل کر دیں۔ میں جب تک خود سیر کرنے نہ جاؤں گا، سیر کے مفید اثرات سے بہرہ یاب نہیں ہو سکوں گا۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ جس طرح یہ جسمانی موثرات ہر روز تمہارے مشاہدہ میں آتے ہیں اسی طرح

ہر عمل کے معنوی موثرات ہیں جو تمہاری فطرت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ (اسے روح کہہ لیجئے یا انسانی فطرت، بات ایک ہی ہے)۔ اور جس طرح یہ تمہارا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ کسی ایک کے جسمانی اعمال کے موثرات، دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو سکتے اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی ایک کے اعمال کے معنوی موثرات سے کوئی دوسرا اثر پذیر ہو جائے۔ ہر شخص کے عمل کا اثر اس کی اپنی فطرت کو متاثر کرتا ہے۔ اگر اعمال صالحہ ہیں تو وہ اس کی فطری صلاحیتوں میں بالیدگی اور ارتقاء پیدا کر دیتے ہیں اور اگر اعمال باطل ہیں تو وہ ان صلاحیتوں کو دبا دیتے ہیں۔ جس کی فطرت انسانیہ میں نشوونما ارتقاء آ سکا وہ نامراد رہا۔ (وقد خاب من دسّٰها)۔

عمل کا نتیجہ جو انسانی فطرت پر اثر انداز ہوتا ہے، ثواب کہلاتا ہے۔ سورۂ تطفیف میں ہے۔

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۸۳/۳۶) کفار کو ان کے اعمال ہی کا نتیجہ (ثواب) دیا گیا۔

ثواب کا مفہوم متعین کر لینے کے بعد اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا ایک کا ثواب (یعنی اس کے کسی کام کا نتیجہ) کسی دوسرے کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے؟ اگر یہ ممکن ہے کہ دوائی میں پیوں اور بخار زید کا اتر جائے تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اچھا کام میں کروں اور اس کے نتیجہ کا اثر زید پر مترتب ہو جائے۔ اور اگر وہ ممکن نہیں تو پھر ایصالِ ثواب بھی کس طرح ممکن ہے؟ یہی حقیقت ہے جسے قرآن نے شروع سے اخیر تک، واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بیان کر دیا ہے (اور آپ نے دیکھ لیا ہے کہ یہ چیز کس قدر عین مطابق فطرت اور بصیرت ہے) کہ ہر شخص کے عمل کا نتیجہ اسی کی فطرت کو متاثر کرتا ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ (۲/۲۸۶) اچھا نتیجہ بھی اسی کے اپنے کام کا ہوگا اور برا نتیجہ بھی اس کے اپنے کام کا۔

(افراد میں بھی اور اقوام میں بھی۔ دیکھئے ۲/۱۴۱ - ۲/۱۳۴)

یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے غلط اعمال کے نتائج کو دوسرے شخص کے صحیح نتائج باطل کر دیں۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۴) (نیز ۱۷/۱۵)

ہر شخص اپنے عمل سے جو کچھ کماتا ہے اس کا نتیجہ اس کے اوپر مترتب ہوتا ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

نہ کسی کے نیک عمل کا نتیجہ دوسرے کی طرف منتقل ہو سکتا ہے نہ برے کام کا۔ اس لئے کہ

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا (۴۱/۴۶ نیز ۴۵/۱۵) جو اعمال صالح کرتا ہے وہ بھی اپنی ذات کے لئے اور جو برے کام کرتا ہے وہ بھی اپنے لئے۔

حتیٰ کہ نہ باپ کے اعمال کے نتائج بیٹے کی طرف منتقل ہو سکتے ہیں نہ بیٹے کے باپ کی طرف۔ یہ ناممکن ہے کہ ورزش بیٹا کرے اور صحت باپ کی اچھی ہو جائے یا دوائی باپ پیئے اور صحتیاب بیٹا ہو جائے۔

يَوْمًا لَّا يَجْزِي وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَيْئًا (۳۱/۳۳) (نیز ...)

ظہورِ نتائج کے وقت نہ باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام آسکتا ہے، نہ بیٹا اپنے باپ کے۔

اس لئے کہ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹)۔ "انسان کے لئے اس کی اپنی کوشش کے نتائج ہی ہیں"۔ یہاں فطرت کا اٹل قانون ہے۔ کسی کا یہ کہنا کہ میرے نیک اعمال کے نتائج کے بدلے میں فلاں کے برے اعمال کے نتائج محو ہو جائیں، فدیہ یا کفارہ کا عقیدہ ہے، جس کی فطرت کے قانونِ مکافات میں کہیں گنجائش نہیں۔ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنكُمْ فِدْيَةٌ (۵۷/۱۵)۔ "ظہورِ نتائج کے وقت تم سے فدیہ نہیں لیا جائے گا"۔ یہ فطرت کے قاعدے کے خلاف ہے۔ میری پیاس تمہارے پانی پینے سے نہیں بجھے گی۔ خواہ ہم دونوں کتنا ہی کیوں نہ چاہیں کہ ایسا ہو جائے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ "ایصالِ ثواب" کا عقیدہ کس طرح "مکافاتِ عمل" کے اس عقیدہ کے خلاف ہے جو اسلام کا بنیادی قانون ہے۔ خدا جانے اس قوم نے کہاں کہاں سے ان عقائد کو بٹورے لیا جنہیں مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا! اور اس صورت میں جبکہ خود قرآن اپنی اصل شکل میں ان کے پاس موجود ہے!! اس سے بڑا تغیر بھی آسمان کی آنکھ نے کم ہی دیکھا ہو گا۔

باقی رہا قرآن پڑھ پڑھ کر مردوں کو بخشنا۔ سو اگر قرآن پڑھنے سے کوئی ثواب حاصل ہوتا ہے تو اس ثواب کا کسی دوسرے کی طرف منتقل ہو جانے کا سوال تو اوپر حل ہو چکا ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا قرآن کے الفاظ دہراتے رہنے سے ثواب بھی ہوتا ہے؟

ثواب کے معنی آپ نے اوپر دیکھ لئے ہیں۔ یعنی کسی کام کا نتیجہ۔ اب سوال یہ رہا کہ کیا محض قرآن کے الفاظ دہراتے رہنے سے کوئی نتیجہ بھی برآمد ہو سکتا ہے؟

آپ غور کیجئے کہ قرآن ہے کیا؟ یہ مجموعہ ہے ان اصولات (یا قوانین) کا کہ فلاں قسم کے کام سے فلاں قسم کا نتیجہ مرتب ہو گا اور فلاں قسم کے کام سے فلاں قسم کا۔ اگر کسی کتاب میں یہ لکھا ہو کہ "پانی پینے سے پیاس بجھ جاتی ہے"۔ آپ کو پیاس لگ رہی ہو۔ اگر آپ ان الفاظ کو سو دفعہ بھی دہرا لیں تو آپ کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ یعنی ان الفاظ کے دہرانے سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو گا۔ نتیجہ مرتب ہو گا ان الفاظ پر عمل کرنے (یعنی پانی پینے) سے۔ اسی سے آپ سوچئے کہ تلاوتِ قرآن کریم سے مفہوم کیا ہے۔ یعنی اس کتاب کو پڑھا جائے تاکہ اسے سمجھ لیا جائے اور سمجھا جائے تاکہ اس پر عمل کیا جائے۔ اگر ان میں سے ایک کڑی بھی کم ہے تو آپ کے لئے اس کتاب کا عدم اور وجود برابر ہے۔ کتاب کے الفاظ دہرا لینے سے یہ سمجھ لینا کہ کتاب کا مقصود حاصل ہو گیا، اپنے آپ کو فریب میں رکھنا ہے۔ یہ فریبِ نفس چند الفاظ سے حاصل ہو جاتا ہے یعنی ثواب۔ برکت۔ نیکی۔ "قرآن پڑھنے سے ثواب ہوتا ہے"۔ "اس سے برکت حاصل ہوتی ہے"۔

"اس کے ایک ایک حرف سے دس دس نیکیاں ملتی ہیں"۔ ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم وآباءکم۔ (چند الفاظ جنہیں تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے وضع کر رکھا ہے) کسی سے کہئے کہ صاحب آپ ثواب برکت یا نیکی کے الفاظ کی جگہ، عام الفاظ میں سمجھا دیجئے کہ قرآن کے الفاظ دہراتے رہنے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ وہ کچھ سمجھا نہیں سکے گا۔ وہ یہی کہے گا کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔

انسانیت کے عہدِ طفولیت کا زمانہ علم المذاہب کی اصطلاح میں عصرِ سحر (Magic Age) کہلاتا ہے، سحر (Magic) کی بنیاد اس نظریہ پر تھی کہ الفاظ میں (ان کے مفہوم میں نہیں بلکہ خود الفاظ میں) ایسا اثر ہے کہ ان کے دہرانے سے ایک نتیجہ مرتب ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں کے وید قریب اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ان کے اکثر منتروں کو اسی طرح پڑھا جاتا تھا (آج بھی منتر کے معنی ہی جادو ہیں) آپ کسی منتری سے کوئی منتر سنئے۔ منتر کے الفاظ کا مفہوم کچھ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ منتر کے لئے بامعنی ہونا ضروری نہیں۔ (اور اگر ان الفاظ کا کچھ مطلب ہوگا بھی تو منتر پڑھنے والے کو اس کے مطلب سے کچھ واسطہ نہیں ہوگا۔ وہ الفاظ کی تاثیر کے لئے انہیں دہرا رہا ہوگا) اس کے متعلق عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ میں تاثیر ہے۔ ہم اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ جادو میں اثر کس طرح سے ہوتا ہے۔[1] اس وقت بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ سحر میں الفاظ کے متعلق یہ نظریہ ہوتا ہے کہ اثر الفاظ میں ہے مفہوم میں نہیں۔ قرآن نے اپنے متعلق کھلے الفاظ میں وضاحت کر دی ہے کہ وہ سحر نہیں ہے۔ یہ عربی مبین (واضح عربی زبان) کی ایک کتاب ہے جس کا پڑھنا، پڑھانا، سمجھنا، سمجھانا نہایت ضروری ہے اور اس کا منشا انسانی زندگی کو صحیح راستہ پر لگانا ہے۔ وہ قرآن میں غور و فکر (تدبر و تفکر) نہ کرنے والوں کو جہنم کا ایندھن اور بدترین مخلوق (شر الدواب) قرار دیتا ہے۔ اب سوچئے کہ کسی کتاب میں تدبر و تفکر کبھی ممکن ہے جب تک اس کے معنی نہ سمجھے جائیں؟ اس لئے قرآن کے الفاظ کو بلا سمجھے دہراتے رہنا اور سمجھ لینا کہ اس سے کچھ (ثواب برکت) حاصل ہوتا ہے اسے کتاب سے منتر بنا دینا ہے۔ اس کتاب کا اس سے زیادہ غلط استعمال اور کیا ہو سکتا ہے؟ غلط استعمال ہی نہیں بلکہ استہزاء۔ اور قرآن اور خدا سے کیا استہزاء ہوگا؟ یہ استہزاء ہے خود اپنی ذات سے جس کے عذاب میں یہ قوم صدیوں سے گرفتار چلی آ رہی ہے وما ھم بخارجین من النار۔

---

(۳) زکوٰۃ بل

ایک اور صاحب رقمطراز ہیں:-

"آپ نے طلوعِ اسلام میں لکھا تھا کہ زکوٰۃ سے مراد وہ ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت مسلمانوں پر عائد کرتی ہے۔ ہماری مجلس آئین ساز کے ایک رکن (چودھری نذیر احمد صاحب) نے

---

[1] اس مسئلہ کے متعلق محترم پرویز صاحب کی کتاب مقاماتِ القرآن (جلد سوم) دیکھئے۔

اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں ایک ریزولیشن پیش کرنے کا اعلان کیا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ حکومت ایک محکمہ قائم کرے جس کا کام زکوٰۃ وصول کرنا ہو اور اسے (غالباً) مساجد مکاتب وغیرہ پر صرف کیا جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حکومت کا ٹیکس الگ ہو گا اور زکوٰۃ الگ۔ کیا یہ درست ہو گا؟

طلوعِ اسلام | زکوٰۃ سے مفہوم وہی ہے جو ہم نے طلوعِ اسلام میں بیان کیا تھا۔ اس کے لئے قرآن میں حکومت کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں سے "وصول کرے۔" خذ من اموالھم صدقۃ (۹/۱۰۳) حتیٰ کہ ان کارکنوں کا بھی ذکر ہے جو زکوٰۃ کی وصولی کے لئے متعین کئے جائیں۔ "والعاملین علیھا" (۹/۶۰) اس لئے زکوٰۃ اس ٹیکس کے علاوہ اور کچھ نہیں جو اسلامی حکومت مسلمانوں پر عائد کرے۔ اس ٹیکس کی کوئی شرح متعین نہیں کی گئی۔ اس لئے کہ شرحِ ٹیکس کا انحصار ضروریات ملی پر ہے۔ حتیٰ کہ ہنگامی صورتوں میں حکومت وہ سب کچھ وصول کر سکتی ہے جو کسی کی ضرورت سے زائد ہو (یسئلونک ماذا ینفقون۔ قل العفو) لہٰذا جب کسی جگہ اسلامی حکومت نہ ہو تو پھر زکوٰۃ بھی باقی نہیں رہتی۔ اس وقت حکومت اپنا ٹیکس وصول کرتی ہے اور اسے اپنی مصلحتوں کے مطابق خرچ کرتی ہے اور جن معاملات میں غیر اسلامی حکومت آپ کی مدد نہیں کرتی انھیں آپ خیرات سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت میں انفرادی خیرات کی ضرورت ہی بمشکل پیش آتی ہے۔ اس لئے کہ جن مقاصد کے لئے خیرات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے وہ تمام حکومت کی ذمہ داریوں میں گھرے ہوئے ہیں جنھیں وہ زکوٰۃ (یعنی ٹیکس سے حاصل شدہ روپیہ) سے پورا کرتی ہے۔ اگر کوئی ایسا معاملہ سامنے آ گیا جس کے لئے حکومت کا دستِ انتظام بروقت نہ پہنچ سکے تو اس کے لئے انفرادی خیرات کی ضرورت محسوس ہو گی (اور ایسے معاملات بالکل شاذ ہوں گے)۔

جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی تو مسلمانوں میں دین اور دنیا الگ الگ ہو گئے اور اسلام، عیسائیت کی دوسری شکل بن کر رہ گیا جس میں خدا کا حصہ خدا کے لئے اور قیصر کا حصہ قیصر کے لئے مختص تھا۔ سلاطین نے اپنے ٹیکس وصول کرنے شروع کئے اور اربابِ شریعت نے زکوٰۃ کو اپنے ہاں واجب قرار دے لیا۔ "وہ قیصر کا حصہ" یہ خدا کا۔ ٹیکس کا روپیہ چونکہ سلاطین کے عشرت کدوں کی رنگینیوں کی نذر ہو جاتا تھا اس لئے مسکینوں اور غریبوں کی ضروریات، انفرادی خیرات سے پوری کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس طرح مسلمانوں پر تین ٹیکس الگ الگ قائم تھے، حکومت کا ٹیکس، مولوی کا ٹیکس اور خیرات کا ٹیکس۔ یہی صورت یہاں انگریزوں کے عہدِ حکومت میں قائم تھی۔ حکومت اپنا ٹیکس الگ لیتی تھی، مولوی اپنا ٹیکس زکوٰۃ کی صورت میں وصول کرتا تھا اور بالکل حکومت ہی کی طرح ایک متعینہ شرح کے مطابق۔ حکومت جیلخانوں کی دھمکی سے اور مولوی قہرِ جہنم میں گرنے والوں کے ڈراوے سے۔ باقی رہے غریبوں اور محتاجوں کے کام، یا کوئی اجتماعی معاملہ، سو ان کے لئے انفرادی خیرات تھی جو چندوں کی شکل میں وصول ہوتی تھی۔ اس طرح یہ مفلس قوم

دوہرے، تہرے عذاب میں مبتلا تھی۔

حصولِ پاکستان کے بعد (بلکہ تحریکِ پاکستان کے دوران میں بھی) ہمارے اربابِ اقتدار میں سے ہر ایک کی زبان پر یہ الفاظ تیرتے پھرتے ہیں کہ اسلام میں روح اور مادہ، دین اور دنیا، مذہب اور سیاست، میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تمیز غیر اسلامی ہے۔ یہ تفریق دوسروں کی پیدا کردہ ہے۔ لیکن عملاً صورت یہ ہے کہ حکومت اپنا ٹیکس الگ وصول کر رہی ہے اور مولوی اپنا ٹیکس (زکوٰۃ) الگ، اور ملت کے اجتماعی امور کے لئے اسی طرح انفرادی خیرات کے چندے ہیں۔ یہ فنڈ اور وہ فنڈ۔ چودہری نذیر احمد صاحب کا مجوزہ بل اسی تفریق کو شاہی سند عطا کرنے کے لئے ہے۔

ظاہر ہے کہ ہماری حکومت ہنوز اسلامی حکومت نہیں۔ اس لئے، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے آجکل زکوٰۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حکومت ٹیکس وصول کر رہی ہے۔ اگر یہ حکومت اسلامی ہو گئی تو یہی ٹیکس زکوٰۃ ہو جائے گا۔ ایک طرف ٹیکس اور اس کے ساتھ دوسری طرف زکوٰۃ، قیصر اور خدا کی غیر اسلامی تفریق ہے اور مسلمانوں جیسی مفلس قوم کو مفلوک تر بنانے کا ذریعہ۔ جو کام آپ زکوٰۃ سے لینا چاہتے ہیں وہ حکومت اپنے ٹیکسوں کی آمدنی سے کیوں نہیں کر سکتی؟ لیکن حکومت خود اسی میں فائدہ دیکھتی ہے کہ لوگ خیرات اور زکوٰۃ کا روپیہ الگ صرف کیا کریں۔ اسی لئے آئے دن چندوں کی اپیل ہوتی رہتی ہے۔ انگریز کے زمانہ میں ان چندوں کی اس لئے ضرورت تھی کہ حکومت کے مقاصد اور ہمارے مقاصد الگ الگ تھے۔ وہ ہماری جن ضروریات کو اپنے خزانہ سے پورا نہیں کرتے تھے، اور ہم انہیں ایسا کرنے پر مجبور بھی نہیں کر سکتے تھے، ان معاملات کو ہم طوعاً و کرہاً اپنے انفرادی چندوں سے پورا کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ کونسا مسئلہ ہے جس میں قوم اور حکومت کے مفاد و مقاصد جداگانہ ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اب اس تفریق کے کیا معنی کہ فلاں کام حکومت کے روپے سے سرانجام پائے گا اور فلاں کام پبلک کے چندہ سے۔ اگر کوئی اہم کام سامنے ہے اور حکومت کے پاس اس کے لئے روپیہ نہیں، تو حکومت ٹیکس لگا کر روپیہ وصول کرے اور اس کام کو پورا کرے! اس طرح وہ رونا بھی ختم ہو جائے گا جو آئے دن چندوں کے غبن کی شکایات کی صورت میں سامنے آتا رہتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ لوگ ٹیکس کو گراں محسوس کرتے ہیں اور چندہ بطیب خاطر دیتے ہیں۔ لیکن آپ نے سوچا بھی کہ ایسا کیوں ہے؟۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم مسلسل ایک سال سے حکومت کی توجہ مبذول کراتے چلے آ رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ حکومت اور پبلک میں کوئی باہمی ربط نہیں۔ حکومت نے کبھی پبلک کو یہ محسوس کرانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ پبلک ہی کی خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ عوام اس وقت تک حکومت کو اپنا نہیں سمجھ سکے۔ ان کے نزدیک حکومت ابھی تک ویسی کی ویسی اجنبی ہے جیسی اس سے پیشتر تھی۔ لہٰذا جب کبھی حکومت کی طرف سے روپیہ کی مانگ آتی ہے تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت کسی "اپنے کام کے لئے" ان پر جرمانہ کر رہی ہے۔ اور چندہ کی صورت میں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ

ہمارا اپنا کام ہے۔ اگر حکومت عوام کو یہ محسوس کرا دے کہ وہ جو کچھ کر رہی ہے انھیں کے کام ہیں تو پھر ٹیکس اور چندہ میں فرق ہی باقی نہ رہے۔ زکوٰۃ اور ٹیکس میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ اول الذکر کی ادائیگی میں انسان سمجھتا ہے کہ یہ میری ہی بھلائی کے لئے ہے اور ثانی الذکر کی صورت میں وہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی دوسرا اپنی ضرورت کے لئے اس سے یہ رقم بطور تاوان وصول کر رہا ہے۔ حکومت کو ایسا بنائیے کہ لوگ ٹیکس کو زکوٰۃ کی طرح بطیب خاطر ادا کریں۔ اسلامی حکومت کی یہی خصوصیت ہوتی ہے۔

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ پچھلے سال کسی صاحب نے اسی اسمبلی میں اس مضمون کا ایک سوال کیا تھا کہ حکومت "بیت المال" کیوں نہیں قائم کرتی؟ یعنی ان کے ذہن میں بھی یہ تھا کہ حکومت کا خزانہ وہ ہے جس میں ٹیکس وغیرہ کی آمدنی جمع ہوتی ہے اور بیت المال وہ جہاں زکوٰۃ کا روپیہ جمع ہوتا ہے۔

یہ ہیں ہمارے وہ اراکین کرام جن سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ اسلامی حکومت کا آئین مرتب کریں گے!

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید　　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

سطور بالا لکھی جا چکی تھیں کہ مجلس دستور ساز کا وہ اجلاس بھی آ گیا جس میں محولہ بالا زکوٰۃ بل زیر بحث آیا۔ مجلس دستور ساز میں ایک طرف دنیا کی عظیم ترین اسلامی سلطنت پاکستان کے وزراء ہیں جو پاکستان کا تصور بحیثیت امام ملل اسلامیہ پیش کرتے ہیں۔ اسی مجلس میں دوسری طرف وہ طائفہ آئین سازان ہے جو اس عظیم ترین اسلامی سلطنت کا نظام حکومت مدون کرنے کا داعی ہے۔ یہ دونوں گروہ نظام حکومت کی اہم ترین مد یعنی اس کے اقتصادی پہلو پر بزعم خود اسلامی نقطۂ نگاہ سے بحث کرتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا آتا ہے، دوسرے کے بعد تیسرا۔ ایک تانتا بندھا ہوا ہے اور ہر ایک اپنی اسلام فہمی اور قرآن دانی کے مظاہرہ میں دوسرے پر بازی لے جانا چاہتا ہے۔ "زکوٰۃ کیا شے ہے؟" اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام"۔ اس سے پیشتر طلوعِ اسلام میں زکوٰۃ کی ایک گونہ وضاحت آ چکی ہے۔ سطور بالا میں مزید وضاحت کی گئی ہے۔ لیکن ہمارے قانون دان آئین ساز اسی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں جس میں انھوں نے قرآن کے الفاظ میں اپنے باپ دادا کو پایا۔ کوئی اللہ کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ صدیوں پہلے کے ذہنِ انسانی کی سوچی ہوئی باتیں صدیوں بعد کے زمانہ میں فرسودہ اور بیکار بھی ہو جاتی ہیں۔ روایتی یاجوج و ماجوج کی طرح ہر شخص روایتی معتقدات کی سد سکندری کو چاٹتے چاٹتے صبح سے شام کر دیتا ہے لیکن بے چارہ جب دوسری صبح کو آ کر دیکھتا ہے تو وہ سد سکندری ویسی کی ویسی ہوتی ہے زبانیں چل رہی ہیں اور اعمال کا لا رہے جا رہے ہیں۔

چودھری نذیر احمد صاحب زکوٰۃ کی اہمیت پر لب کشائی فرماتے ہیں: "مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ سالانہ بچت کا چالیسواں حصہ خیراتی امور پر صرف کریں"۔ کس نے فرض کر دیا؟ خدا نے تو یہ حکم نہیں دیا۔ قرآن کہیں

سالانہ بچت کے چالیسویں حصہ کو خیرات پر صرف کرنے کے لئے نہیں کہتا۔ آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ یہ تناسب ناقابلِ تبدیل ہے۔ حتیٰ کہ حکومت بھی اسے بدلنے کی مجاز نہیں۔

"زکوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ دولت گردش کرتی رہے اور تجارت ترقی کرے"۔ کیا جو قومیں نذیر صاحب کے تصور کی زکوٰۃ نہیں دیتیں ان کے ہاں دولت گردش نہیں کرتی رہتی؟ اور کیا ان کے ہاں تجارت ترقی نہیں کرتی؟ موجودہ زمانے میں تو جہاں زکوٰۃ کو کوئی نہیں جانتا وہاں تجارت کا کہیں زیادہ چرچا ہے۔ دولت کی گردش بھی یقیناً انھیں ممالک میں زیادہ ہے جہاں کے باشندے زکوٰۃ نہیں دیتے۔

"اسلام کی مالی حکمت عملی اشتمالیت اور سرمایہ داری کے بین بین ہے۔ (اسلام کا) مقصد ہے کہ ایک سطح راہ متعین کر دی جائے تاکہ ہر شخص کو اپنی افتادِ مزاج کے مطابق نشوونما کے مواقع میسر آسکیں"۔ بجا فرمایا آپ نے! لیکن یہ تو فرمائے کہ اسلام کی وسطی راہ بھک منگوں اور انفرادی خیرات کے مستحقوں کے لئے نشوونما کے ذرائع کہاں سے مہیا کرے گی؟ انفرادی خیرات اور اس کا ہمارے انداز و تصور کا مصرف قوم کو اپاہج تو بنا سکتا ہے، اس کے انا کو بیدار و مستحکم نہیں کر سکتا۔

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے: "اگر زکوٰۃ حکومت کے ذریعہ جمع کی جائے تو پاکستان کے غریب باشندوں کی حالت بہت حد تک بہتر ہو جائے گی"۔ گویا اگر زکوٰۃ وصول نہ کی جائے تو عوام کی حالت بدستور ابتر رہے گی۔ یا اگر حکومت کے پاس زکوٰۃ کی مد نہ ہو تو عوام کی حالت بہتر بنانے کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوتی، یا اس ضمن میں اس سے چنداں توقعات وابستہ نہیں کی جاتیں۔ ملکی افلاس کا استیصال ملت کا فریضہ ہے، لہٰذا ملت کی نمائندہ حکومت کا فریضہ ہے۔ اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ اس وقت جو ٹیکس ادا کر رہے ہیں وہ حکومت کی جملہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے کفایت نہیں ہیں تو آپ ٹیکس کی نئی صورتیں پیدا کیجئے اور ملی خزانہ میں مزید رقوم جمع کیجئے تاکہ حکومت، جو آپ سے علیحدہ کچھ شے نہیں، بلکہ آپ ہی کا قائم کردہ مرکزی ادارہ ہے، محض آمدنی کی کمی سے اجتماعی ضروریات پوری کرنے سے قاصر نہ رہ جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری ملی ضروریات دن بدن بڑھتی جاتی ہیں۔ ملت میں اتنے تقاضوں کو پورا کرنے کی استطاعت ہونی چاہیئے۔ یہی احساس و شعور عوام کی حالت بہتر بنانے کا ضامن ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب ملت میں یہ احساس عام ہو جائے گا کہ اس کا مرکزی ادارہ آمدنی کی کمی کی وجہ سے مجبور ہے کہ کئی ملی مسائل کی طرف کما حقہٗ توجہ نہ دے تو وہ اپنی آمدنی بڑھانے میں ساعی ہوں گے۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ ٹیکس ادا کر سکیں اور مرکزی خزانہ کو اس قابل بنا سکیں کہ وہ ان اخراجات کا متحمل ہو سکے۔ جب ہم اپنے ہی تلے اندازوں کے مطابق بہ انداز کہن خیرات کرتے اور مستحقین کا تعین انفرادی فیصلوں کے مطابق کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ عوام کی حقیقی بہتری نہیں ہوتا۔ کیونکہ خیرات لینے والے سالانہ خیرات اور دیگر صدقات کے انتظار و توقع میں دست و بازو کی محنت سے گریز کریں گے۔ ایسے کام چوروں کی ہم میں کمی نہیں۔ گداگری جسے روکنے کیلئے اسی اجلاس مجلس دستور ساز میں زکوٰۃ کا علاج پیش ہوا، دراصل زکوٰۃ اور صدقات کے غلط مصرف کا براہِ راست

قیصر ہے۔ آپ زکوٰۃ اسی اضافے سے ضائع کرتے جائیے جس انداز سے کرتے چلے آئے ہیں۔ گداگر اور کام چور تعداد میں زیادہ ہی ہونگے، کم نہیں ہوں گے۔

مولانا اکرم خاں فرماتے ہیں: زکوٰۃ حکومت کے ذریعہ وصول کرنی چاہیئے اور جہاں حکومت ایسا نہ کرے وہاں قومی ادارہ اس فریضہ کو سرانجام دے۔ بالفاظ صحیح تر اگر حکومت پاکستان اس ذمہ داری کو قبول نہ کرے تو قوم ایک الگ ادارہ تشکیل کرے اور زکوٰۃ کی وصولی اور اس کا مصرف اس کے سپرد کرے۔ قوم اور حکومت کی ثنویت ہمارے دماغوں میں کتنی گہری ہے! آپ کو کون سمجھائے کہ حکومت خارج سے مسلط نہیں ہوتی۔ یہ ملت کی کوآپریٹو سوسائٹی ہے۔ ملت اپنا ایک مرکزی ادارہ قائم کرتی ہے اور اپنے تمام اجتماعی اور مشترکہ مسائل اس کے سپرد کر دیتی ہے۔ ملت ایسا کرکے خود معطل اور بے بس نہیں ہو جاتی وہ خود اس ادارہ کو چلاتی ہے، اس پر موثر ہوتی ہے، اس کا محاسبہ کرتی رہتی ہے۔ یہ مضحکہ انگیز ہے کہ ملت اجتماعی امور کے لئے ایک مرکز قائم کرے۔ لیکن ایک مد ـــ زکوٰۃ ـــ کے لئے ایک اور جداگانہ ادارہ قائم کرے۔ زکوٰۃ کے لئے علیحدہ ادارے کا سوال یوں پیدا ہوتا ہے کہ ہم حکومت کو دنیاوی امور کا ضامن سمجھتے ہیں اور نام نہاد مذہبی امور بدستور اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ دین اور دنیا خلط ملط نہ ہو جائیں۔ خدا ایک طرف رہے اور قیصر دوسری طرف۔ اس غیر شعوری اعتراف کے باوجود ہم بکرات و مرات اعلان کرتے رہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست میں کوئی فرق نہیں۔ وہ ایک ہی شے ہیں۔ ہم نے عملاً مذہب اور سیاست کو الگ الگ کر رکھا ہے اور انہیں یکجا نہیں ہونے دیتے۔ ہم اس سے پیشتر بھی لکھ چکے ہیں کہ اگر ایسا ادارہ زیر حکومت یا بغیر حکومت قائم ہو گیا تو اس کا یہی نتیجہ نکلے گا کہ ٹیکس تو حکومت کے خزانے میں جائیں گے اور زکوٰۃ اور خیرات "بیت المال" میں جمع ہو گی۔ ٹیکسوں والا خزانہ حکومت کے تصرف میں ہوگا اور بیت المال "قوم" (ارباب مذہب) کے قبضہ میں۔ حکومت کالج کھولے گی اور قوم دارالعلوم۔ ایک دنیا کا اجارہ لیگی اور دوسری دین کا۔ ہم جس ثنویت کا جائزہ لے رہے ہیں، اس کے نوک نشتر کی زد کہیں دور تک پہنچتی ہے۔ حال ہی میں صوبہ سرحد کے وزیر تعلیم میاں جعفر شاہ صاحب نے اپنی تعلیمی منصوبہ بندیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک خبر رساں ایجنسی کو بتایا کہ وہ عنقریب اسلامیہ کالج (پشاور) میں ایک دارالعلوم کھول رہے ہیں! پہلے تو یہ لطیفہ ملاحظہ فرمائیے کہ ایک وزیر تعلیم ـــ تعلیم! ـــ کالج اور دارالعلوم میں فرق کر رہا ہے۔ لیکن ہنسئے نہیں۔ فرق ظاہر ہے۔ ایک انگریزی لفظ ہے، دوسرا عربی۔ ایک دنیاوی ہے دوسرا دینی۔ ہر چند کالج بھی ایک درس گاہ علم ہے اور دارالعلوم بھی درس گاہ علم، لیکن جعفر شاہ صاحب درحقیقت دین و دنیا کا فرق پیدا کر رہے ہیں۔ وہ کالج میں تو علوم حاضرہ (دنیوی) کی تعلیم دلائیں گے اور دارالعلوم میں علوم مذہبی کی۔ ایک جگہ مسٹر پیدا ہوں گے، دوسری جگہ مولانا۔ وہ تخت کے وارث ہوں گے، یہ راکب مصلیٰ ہوں گے۔ قوم! بدبخت قوم!! ان کو ٹیکس دیگی، ان کو زکوٰۃ دیگی۔ قوم کی کمر ٹوٹے گی ـــ اور نذیر احمد صاحب کے تصور میں عوام کی حالت سنوریگی اور تجارت کی راہیں کشادہ ہوں گی!

یہ تو خدا (مذہب) کے نمائندے گفتگو فرما رہے تھے۔ اب قیصر (دنیا) کے نمائندوں کی باری آتی ہے۔

پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد صاحب تشریف لاتے ہیں۔ آپ کو زکوٰۃ کے وصول پر اعتراض نہیں بلکہ (ارباب مذہب کے جذبات سے) ہمدردی ہے۔ لیکن

> زکوٰۃ کی حکومت کے ذریعہ وصولی سے موجودہ ٹیکسوں پر اثر پڑنے کا احتمال ہے۔ ۱۳۰۰ سال پیشتر (یعنی جب زکوٰۃ ایجاد ہوئی تھی) ٹیکس زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ اب گراں بار ٹیکس ناگزیر ہوگئے ہیں۔ . . . (لہٰذا) اگر مسلمان ——— (غور فرمایئے!) زکوٰۃ دینا چاہتے ہیں تو وہ ایسا کر لیں، لیکن وہ (مجھ سے) زکوٰۃ کے عوض میں دوسرے ٹیکسوں میں کسی قسم کی رعایت یا تخفیف مطلب کریں۔

مسٹر اور مولانا آمنے سامنے ہیں۔ مسٹر کو اس سے سروکار نہیں کہ مولانا کیا کرنا چاہتا ہے اور کیوں؟ وہ اس کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتا۔ وہ صرف اس قدر ضمانت چاہتا ہے کہ اس کے جملہ حقوق محفوظ رہیں گے یعنی اس کے ٹیکسوں پر زد نہ پڑے تو ملّا جیسے جی چاہے قوم کا خون چوسے۔ مسٹر غلام محمد یہ نہیں جانتے کہ زکوٰۃ اور صدقات کے نام پر ملّا نے قوم کی جیبیں خالی کر دیں تو وہ تخفیف کیا طلب کرے گی وہ ٹیکس کی ادائیگی کے قابل ہی نہ رہے گی۔ لیکن

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

مسٹر اپنے ٹیکس پورے کرے گا، مولانا اپنے صدقات وصول کرے گا۔ دونوں میں سے ایک کو یہی تو خیال نہیں کہ یہ دوہرا بوجھ اٹھانے والی کمر کس کی ہوگی؟ قوم نہ اس کی، نہ اس کی۔ قوم کا مالک اللہ، جو پتھر کے کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے وہ ان انسانی کیڑوں کو بھی رینگتا رکھے گا!!!

غلام محمد صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ انھوں نے ممالکِ اسلامیہ سے خط و کتابت شروع کر رکھی ہے کہ زکوٰۃ کو وہ کیسے وصول کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اگر زکوٰۃ بل مجلس دستور ساز میں پیش نہ ہوتا تو قوم کو کبھی پتہ بھی نہ چلتا کہ حکومتِ پاکستان اس اہم معاملہ پر ممالکِ اسلامیہ سے استصواب کر رہی ہے۔ کیا حکومت اور غلام محمد صاحب کو ممالکِ اسلامیہ سے استفسار کرتے وقت یہ یقین ہوگیا تھا کہ ملک کا کوئی اہل الرائے اس ضمن میں انھیں مشورہ نہیں دے سکتا؟ کیا یہ پاکستانی اصحابِ علم کا صریح استخفاف نہیں؟ کیا یہ خود وزیر بلکہ حکومت کی ہتک نہیں؟ اصحابِ علم تو رہے ایک طرف، سوال یہ ہے کیا مجلس دستور ساز کے ماہرینِ آئین ارکان میں ایک بھی با خبر اور اہل نہیں تھا؟ اور اس کے بعد یہ کہ کیا انھوں نے اس کا اطمینان کر لیا ہے کہ ان کے خدا نے ان کے لئے جو ضابطۂ قوانین (قرآن) مرتب کیا ہے اس میں بھی اس مشکل مسئلہ کا کوئی حل لکھا ہے یا نہیں؟ (لیکن قرآن تو مُردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے ہے۔ زندوں کو اس سے کیا سروکار!) پھر اتنا ہی نہیں کہ حکومت محض خط و کتابت ہی کر رہی ہے بلکہ ان ممالک میں اپنے افسر مقرر کرے گی جو مناسب تجربہ اور تربیت حاصل کریں گے۔ ہم حیران ہیں کہ حکومت کیا تجربہ حاصل کرنا چاہتی ہے؟ ہمیں افسوس ہے کہ اس اہم مسئلہ کو بالکل دفتری انداز سے رسوا کیا جا رہا ہے۔ حجت کو اولویت قرار دے عارف

دفاتر میں یہی ہوتا ہے کہ ایک بات پیدا ہوئی وہ دوسرے کے پاس "مشورہ" کے لئے بھیج دی جاتی ہے۔ دوسرا تیسرے کے پاس بھیج دیتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض حالتوں میں یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کاغذات کس کے پاس رکیں اور کون رائے دے۔ حکومت کے سامنے زکوٰۃ کا مسئلہ آیا۔ اس نے مخصوص انداز میں اسے ممالکِ اسلامیہ کی طرف بھیج دیا۔ وہاں سے جو جواب آئے گا اس پر مقلدانہ و عقیدت مندانہ انداز سے عمل درآمد شروع ہو جائے گا اور کوئی اس پر تنقید کرنے کا مجاز نہیں رہے گا، کیونکہ وہ اسلامی ممالک کا عمل ہو گا!

ہم غلام محمد صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور اپنے ملک پر اعتماد کریں۔ مسائل کا حل کاغذی فائلوں سے نہیں ہو گا۔ انسان اور انسانی دماغ ان کو حل کریں گے۔ یہ سنگ ہائے راہ جس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں وہی ان کو ہٹا سکتا ہے، وہی ان کو ٹھکرا سکتا ہے۔ وہ خط لکھ لکھ کر مجرب نسخے نہیں پوچھے گا بلکہ اپنے عزمِ راسخ سے، اپنی سعیِ پیہم سے ان سے گزر جانے میں کامیاب ہو گا۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اب بھی وقت ہے کہ حکومتِ پاکستان سنجیدگی اور ذمہ داری کا مظاہرہ کرے اور بیرونِ خانہ ٹامک ٹوئیے مارنے کی بجائے اندرونِ خانہ توجہ کرے اور ملی مسائل کو قرآن کے محکم اصولوں کی روشنی میں تاریخی تقاضوں اور موجودہ ملی ضرورتوں کے مطابق حل کرے۔ ہم اسے پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ وہ ٹیکس جو اسلامی حکومت کی طرف سے عائد ہوتا ہے، قرآن کی اصطلاح میں زکوٰۃ کہلاتا ہے، اور حکومت مجاز ہے کہ اس کی شرح حسبِ ضرورت متعین کرتی رہے۔ اور وہ خزانہ جس میں یہ ٹیکس اور دیگر محاصلِ حکومتِ اسلامیہ جمع ہوتے ہیں، عربی زبان میں بیت المال کہلاتا ہے۔

---

(۳) اسلامی جماعت

مکتوب گرامی! میں "طلوعِ اسلام" ایک عرصہ سے پڑھتا ہوں اور اس کی حقیقت نگاری، حق گوئی اور سلجھی ہوئی فکر کا مداح رہا ہوں لیکن تازہ پرچہ (بابت ماہ نومبر ۱۹۴۸ء) کے "لمعات" میں کچھ عجیب انتشارِ فکر اور تضاد سا محسوس کر رہا ہوں —

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ نے ان صفحات میں قارئین کو اسلامی جماعت کے دینی اور سیاسی موقف سے خبردار کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ گروہ بھی قادیانیوں کی طرح مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتا بلکہ اسلام اور مسلمانوں کو دو علیحدہ چیزیں تصور کرتا ہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بیحد حیرت ہوئی کہ جس جرم کا مجرم آپ ان کو گردانتے ہیں اس کا ارتکاب خود آپ نے بھی کیا ہے۔ صفحہ ۹ پر آخری پیراگراف میں آپ فرماتے ہیں "آپ حیران ہوں گے کہ ہم نے یہ کیا کہہ دیا کہ ان کا یہ ڈر بجا ہو گا۔ ہاں نہ صرف ان کا یہ ڈر بلکہ ایک حد تک وہ پروپیگنڈا بھی جو مسلمانوں کے نظامِ حکومت کے خلاف دنیا کرتی چلی آئی ہے اور آج بھی کر رہی ہے۔ جیسا کہ ہم بار بار بالوضاحت بیان کر چکے ہیں، مسلمانوں کا (اسلام کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا) نظامِ مملکت و آئینِ شریعت اپنے اکثر و بیشتر حصوں میں ایسا ہی رہا ہے جسے ہم دنیا کے سامنے کبھی بھی فخر کے ساتھ

پیش نہیں کر سکتے "۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان پہلے یا اب جو کچھ بھی کرتے رہے ہیں وہ اسلام کی نمائندگی نہیں قرار دیجا سکتی۔ اگر اسلام کی نمائندگی کرنا ہے تو اسلام اور صرف اسلام ہی کو اختیار کرنا پڑے گا۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر آپ کا اسلامی جماعت پر یہ اعتراض کہ "اس جماعت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے آپ کو اسلامی جماعت کہہ کر باقی مسلمانوں کے گویا غیر اسلامی ہونے کا اعلان کر دیا اور اس طرح بعد و منافرت کا وہی بیج جس پر تحریک قادیانیت کی اساس تھی از سرِ نو بو دیا گیا۔ اس کے بعد امیر جماعت نے جماعت کے اراکین کی تجدید ایمان کی اور اس طرح اپنے دست حق پرست پر گویا از سرِ نو مسلمان کیا۔" کچھ بے معنی سا اعتراض معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا عجیب تضاد جو لمعات کے غائر مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ اسلامی نظام کی حمایت و وکالت کرتے ہوئے احوال و واقعات پر اسلامی اصولوں کی روشنی میں تنقید کرتے ہیں اور اسلامی اصولوں کی علمبرداری کے جوش میں اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھی اسلام کی کسوٹی پر پرکھ کر ناقص قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف ایک اسلامی جماعت پر تنقید کرتے ہوئے اسے کبھی قیادت کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور کبھی قوم پرستی کے ترازو میں تولنے لگتے ہیں۔ قارئین تو متوقع ہیں کہ آپ قرآن و حدیث کی کسوٹی پر اس جماعت کو پرکھ کر یہ بتائیں گے کہ آیا یہ گروہ خدا و رسول کی اطاعت کی طرف بلا رہا ہے یا نہیں، شرک و الحاد سے روکنے کی کوشش کر رہا ہے یا نہیں۔ اسلامی نظامِ زندگی چاہتا ہے یا نہیں۔ منبع رشد و ہدایت قرآن و حدیث کو مانتا ہے یا نہیں اور آپ ہیں کہ کبھی تو کہتے ہیں کہ یہ لوگ اس لئے برے ہیں کہ مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ قیادت میں کیڑے ڈالتے ہیں، قیادت کے منصب پر حاملین شریعت کو فائز دیکھنا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مجھے توقع ہے کہ آئندہ اشاعت میں آپ اس تضاد کو رفع کر دیں گے اور اس جماعت پر خالص اسلامی نقطۂ نظر سے (یعنی آپ ہی کے لفظوں میں مسلمانوں کے نہیں بلکہ اسلام کے نقطۂ نظر سے) قرآن و حدیث کی روشنی میں تنقید فرما کر اس کے ہر غیر اسلامی پہلو کو بے نقاب کر دیں گے۔

الراقم عبدالوحید خاں محلہ شاہ جمال پارک۔ لاہور

طلوعِ اسلام جماعت اسلامی کے متعلق جو کچھ طلوعِ اسلام میں لکھا گیا ہے اس کا اگر بغائر مطالعہ کر لیا جاتا تو یہ ذہنی انتشار اور تضاد محسوس نہ ہوتا۔ اسلامی جماعت اور طلوعِ اسلام کے مسالک میں کس حد تک اشتراک ہے اور کہاں سے ان کا مقامِ فراق شروع ہوتا ہے اس کے متعلق طلوعِ اسلام بابت ماہ ستمبر کے لمعات میں بصراحت لکھا جا چکا ہے۔ اس پرچہ میں نیشنلسٹ مسلمانوں اور مسلم لیگ، کے دعاوی کے تذکرہ کے بعد لکھا گیا تھا۔

> دورانِ تحریک میں ایک تیسری آواز اٹھی جس نے یہ کہا کہ بیشک مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قوم نہیں بن سکتے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان محض پیدائشی مسلمان ہیں جن کا مسلمان ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ انہیں پہلے سچے معنوں میں مسلمان ہونا چاہئے۔ اس کے بعد آزادی کا مطالبہ۔ پیدائشی

مسلمان، انگریز یا ہندو کے غلام رہیں تو کیا اور اپنی الگ حکومت قائم کر لیں تو کیا۔ ان کی آزادی صحیح معنوں میں آزادی اسی صورت میں کہلا سکتی ہے جب وہ اپنے اندر اسلامی صفات پیدا کریں۔ اس نظریہ کے مدعیان نے اپنے آپ کو "اسلامی جماعت" کے نام سے متعارف کرایا۔

اس کے بعد لکھا گیا تھا۔

طلوعِ اسلام اس حد تک اسلامی جماعت کے ساتھ ہم نوا تھا کہ مسلمان صرف اسی صورت میں آزاد کہلا سکتا ہے جب وہ اپنی مملکت میں خدا کا قانون رائج کرے۔ لیکن اس کا مسلک یہ تھا کہ خدا کے قانون کو رائج کرنے کے لئے کسی خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم ہندوستان میں کسی خطۂ زمین کے مالک نہیں بن جاتے اس وقت تک حکومت خداوندی کے قیام کا امکان نہیں۔ لہٰذا مسلم لیگ کی تحریک تقسیم ہندوستان کو کامیاب بنانے کے لئے ہمیں پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ اس کی کامیابی سے ہمیں وہ امکانی قدرت حاصل ہو جائے گی جس سے اس زمین پر آسمان کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھ سکے۔ اگر ہم نے اس وقت تغافل برتا تو انگریز پورا ہندوستان ہندو کے سپرد کر دے گا جس سے ہمیں یہ امکانی قدرت حاصل نہ ہو سکے گی۔ ہمیں مسلم لیگ کی اس سیاسی تحریک کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو قرآن کے قریب لانے کی کوشش بھی جاری رکھنی چاہیئے۔

اس کے بعد لکھا تھا۔

لیکن اسلامی جماعت کے نزدیک یہ مسلک قابلِ قبول نہ تھا۔ وہ پیدائشی مسلمانوں کے قومی اور اجتماعی مطالبات سے ہم آہنگی اور تعاون کو اسی طرح تعاون علی الاثم والعدوان سمجھتی تھی جس طرح مرزائی حضرات مسلمانوں سے روابط قائم کرنے میں کفر و فسق محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اس جماعت نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی اس تحریک سے عملاً الگ رکھا اور دوسروں کو اس سے الگ رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ . . .

ہم اپنے محترم بھائی سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا ان کے نزدیک، تحریک پاکستان کے دوران میں اسلامی جماعت کا یہ مسلک فی الواقعہ اسلام کی خدمت تھی؟

یہ تو تھا تحریک پاکستان کے دوران میں۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد، یہاں کا مسلمان جس نازک دور سے گذر رہا ہے اور جس طرح اس کے سامنے موت اور زندگی کا سوال پیش ہے۔ اس میں اس "اسلامی جماعت" کا جو مسلک ہے وہ بھی ہر ایک کو معلوم ہے۔ وہ پھر اپنی اسی دعوت کو دہراتے چلے جا رہے ہیں کہ جب تک مسلمان سچے معنوں میں مسلمان نہیں بن جاتا ان کے کسی اجتماعی مسئلہ میں تعاون، اسلام کی رو سے جائز نہیں ہے۔ آپ نے وہ خط دیکھ لیا ہوگا جس کی بنا پر مودودی صاحب کی گرفتاری عمل میں لائی گئی تھی۔ اور جس میں مذکور تھا کہ جب تک

یہاں اسلامی شریعت کا نفاذ نہیں ہو جاتا، پاکستان کی فوج میں بھرتی ہونا صحیح نہیں۔

ہم اپنے محترم بھائی سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اس وقت اسلامی جماعت کا یہ مسلک اسلام کی خدمت ہے؟ یہ ہے "قومیت پرستی" کا وہ ترازو جس میں ہم اسلامی جماعت کے کارناموں کو تولتے ہیں!

پھر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ قائداعظم (مرحوم) کی یہ کوشش جس کی بنا پر پاکستان کا وجود عمل میں آگیا ہے موجبِ تشکر و امتنان ہے یا اس قابل کہ اس میں "کیڑے ڈالے جائیں"۔ سوچئے اور پھر خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ "اسلامی جماعت" نے اس وقت تک جو کچھ کیا ہے اسے اسلام کی خدمت کہا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اسلامی جماعت کا مسلک یہ ہے کہ موجودہ مسلمان' جو اسلام کے معیار پر پورا نہیں اترتا' زندہ رہ جائے یا فنا کر دیا جائے برابر ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مسلک، اسلام سے محبت نہیں، اس سے سخت دشمنی ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ مسلمان جیسا کچھ بھی ہے' اسے زندہ رکھنے کی کوشش کیجئے کہ اگر یہی باقی نہ رہا تو پھر صحیح معنوں میں مسلمان بناؤ گے کسے؟ جا کر اسپین میں، اور وہاں کسی کو "صحیح معنوں میں مسلمان" بنا کر دکھاؤ! اگر یہاں بھی "اسلامی جماعت" کی "مبارک کوششوں" سے مسلمانوں کا وہی حشر ہو جائے جو اسپین میں ہو چکا ہے تو فرمائیے کہ یہ کوشش اسلام کے ساتھ دوستی کہلائے گی یا دشمنی؟ حیرت ہے کہ ہسپانیہ کے عیسائیوں کو آپ آج تک اسلام کا بدترین دشمن قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے وہاں کے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیا۔ لیکن یہاں جو جماعت یہ کہتی ہے کہ ہندوستان یا پاکستان میں مسلمانوں کا عدم و وجود برابر ہے، اور ایسا طرزِ عمل اختیار کرتی ہے جس کا نتیجہ یہاں کے مسلمانوں کی بربادی اور تباہی ہو۔ تو اسے آپ **اسلامی** جماعت قرار دیتے ہیں اور ان کی "مساعی جمیلہ" کو اسلام کیلئے احسانِ عظیم سمجھتے ہیں! یہ ایک سیدھی سی بات ہے جس کے لئے کسی فقہی موشگافیوں اور شرعی نکات آفرینیوں کی ضرورت ہی نہیں۔ جذباتی طور پر یہ دعوت بڑی خوش آئند محسوس ہوتی ہے کہ ایسے نام کے مسلمانوں سے زندہ رہنے سے تو اچھا ہے کہ یہ کہیں فنا ہو جائیں اور ان کی وجہ سے اسلام بدنام نہ ہو۔ لیکن سوچئے کہ "جذباتی شاعری" اگر کہیں عملی صورت اختیار کر جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہو! اگر کہیں دو چار سو سال پہلے یہاں کوئی مودودی صاحب پیدا ہو گئے ہوتے تو آج یہاں یہ کہنے والا بھی کوئی نہ ہوتا کہ اسلام کو ایک عملی قوت بننا چاہئے۔ آج جو حضرات اسلامی جماعت کے ارکان اور احیاءِ اسلام کی تحریک کے علمبردار بنے ہیں وہ انہی مسلمانوں کی اولاد ہیں جو ہماری طرح غیر اسلامی اجتماعی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان حضرات کے مسلک کے مطابق جن کا عدم اور وجود برابر تھا۔ اس زمانہ میں چونکہ کوئی "اسلامی جماعت" پیدا نہ ہوئی اس لئے اُن کا وجود باقی رہا اور اس طرح آج یہ لوگ مسلمانوں کے گھرانوں میں پیدا ہو کر اسلامی جماعت کے افراد بن گئے۔ ورنہ اگر وہ لوگ مسلمان نہ رہتے۔ تو یہ حضرات آج کسی شردھانند اور دیارام کے گھر میں پیدا ہوتے اور انہیں عمر بھر اس کا خیال تک بھی نہ آتا۔ کہ اسلام میں کوئی خوبی ہے بلکہ یہ اسلام کے نام سے بیزار ہوتے۔ اور دوسرے غیر مسلموں کی طرح اسے گالیاں دیا کرتے۔ لہٰذا ہم عالموں اور خطیبوں کا دعویٰ کے نزدیک گنہگار

مسلمانوں کا وجود ان کے عدم وجود سے بہرحال بہتر ہے، کہ اس سے اور کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو، اس کا امکان تو ہو سکتا ہے کہ ان سے یا ان کی اولاد سے کوئی ایسا بھی پیدا ہو جائے گا جس کے دل میں اسلام کی بہبودی کی تڑپ ہو۔ اگر یہ گنہگار (پیدائشی) مسلمان باقی نہ رہیں (اور شدھ ہو جائیں) تو یہ امکان بھی ختم ہو جائے۔

اس کے بعد آپ سوچئے کہ ان حضرات کے اس مسلک کی بنیاد کس چیز پر ہے؟ اسی جذبۂ نفرت پر جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ نفرت تمام مسلمانوں سے، بجز ان چند لوگوں کے جو ان کی جماعت کے ممبر بن جائیں! لیکن اس نفرت کو مقدس اور حسین بنا لیا گیا ہے یہ کہہ کر کہ یہ لوگ مسلمان ہی نہیں ہیں اس لئے ان سے محبت کیوں کی جائے۔ مسلمان صرف ہم ہیں (جنہوں نے اسلامی جماعت کی رکنیت قبول کر لی ہے) اور ہماری باہمدگر محبت ہے۔ ہم اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ مسلمانوں کے متعلق اس قسم کا جذبۂ منافرت کس حد تک جائز قرار دیا جا سکتا ہے اور ان کی تکفیر و تفسیق کہاں تک اسلامی خدمت۔ اس کے متعلق سردست خود مودودی صاحب کے وہ الفاظ سن لیجئے جو انہوں نے اپنے دعوئے امارت سے پہلے تحریر فرمائے تھے اور جن میں مسلمانوں کی تکفیر و تفسیق کی شدید مخالفت کے بعد لکھا تھا۔

> اس فتنہ کی محرک خواہ تنگ نظری ہو نیک نیتی کے ساتھ، یا خود غرضی، حسد اور نفسانیت ہو بدنیتی کے ساتھ، بہرحال اس نے جمیعت اسلامی کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، شاید اور کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ . . . . قطع نظر اس کے مسلمانوں کی تکفیر و تفسیق ایک سنگین قومی جرم بھی ہے۔ جو شخص کسی ایک مسلمان یا مسلمانوں کے کسی گروہ پر ناحق کفر کا فتویٰ لگاتا ہے، وہ صرف اسی شخص یا گروہ کے حق میں ظلم نہیں کرتا بلکہ پوری اسلامی جمیعت پر ظلم کرتا اور خود اسلام کو ضرر عظیم پہنچاتا ہے۔ اس کی وجہ ادنیٰ تامل سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ . . . . اسلام میں کسی شخص یا گروہ کو کافر کہہ دینے کے معنی صرف یہ نہیں کہ اس کے اعتقاد اور نیت پر حملہ کیا گیا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی جمیعت اور اس کے ایک فرد یا چند افراد کے درمیان برادری، محبت، معاشرت، معاملت، اور تعاون باہمی کے سارے رشتے کاٹ دیئے گئے اور امتِ مسلمہ کے جسم سے اس کے ایک عضو یا متعدد اعضاء کو چھانٹ کر پھینک دیا گیا۔ (ترجمان القرآن بابت ماہ صفر ۱۳۵۲ھ)

مودودی صاحب کے اس مضمون میں "جمیعتِ اسلامی" "قومی جرم" "اسلامی جمیعت" "امتِ مسلمہ کا جسم" وغیرہ اصطلاحات خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ یہ وہی "اسلامی جمیعت" اور قومیت ہے جس کی وہ آج اس طرح سے تضحیک و تحقیر کر رہے ہیں۔ آج ان کے نزدیک مسلمانوں کا ایک قوم ہونا انتہائی جرم ہے اور شدید ترین غیر اسلامی عقیدہ حالانکہ کل تک وہ اس جمیعت اور قوم کی وحدت و اجتماعیت اور ترصیص و توطید کو اس درجہ اہم خیال کرتے تھے اس میں انتشار و افتراق ان کے نزدیک سنگین جرم تھا۔ وہی جرم جس کے وہ آج خود کس شدت سے مرتکب ہو رہے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ انہوں نے مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ لیکن انہوں نے

اگر یہ الفاظ نہیں کہے تو اس سے اصل حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کا نتیجہ وہی ہے جو خود ان کے الفاظ میں تکفیر و تفسیق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی مسلمانوں کی جمعیت میں انتشار۔ امتِ مسلمہ کے جسم سے ایک عضو یا متعدد اعضا کو کاٹ کر الگ پھینک دینا۔ ان کے اجتماعی امور میں تعاون و تناصر کے تمام رشتوں کو کاٹ دینا۔ سوچیے کہ اسلامی جماعت نے یہی کچھ کیا ہے یا نہیں! "نیک نیتی سے یا بدنیتی سے"۔ اس سے (خود مودودی صاحب کے الفاظ میں) ان کی اس حرکت کے قابلِ مذمت ہونے پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔

پھر یہ بھی سوچیے کہ اس جماعت نے مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچانے کی کوششوں کے ساتھ، اپنی اسلام دوستی میں کونسا تعمیری کام کیا؟ یا یہ کہ تمام مسلمانوں کو نام کا مسلمان کہہ کر، خود وہ کونسی زندگی اختیار کی جسے "سچے معنوں میں مسلمان" کی زندگی کہا جاتا ہے! تعمیری کام جو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ ان کا سارا کارنامہ، اپنا لٹریچر بیچنا ہے۔ باقی رہی ان کی "اسلامی زندگی" سو اس موضوع پر بات ذاتیات تک آجاتی ہے، اس لئے اس سے احتراز کرنا چاہیے (تا آنکہ معاملہ کی اہمیت خود اس کی متقضی نہ ہو جائے) بحیثیت مجموعی دیکھیے تو صاف نظر آجائے گا کہ جس قسم کی اجتماعی زندگی باقی مسلمان بسر کرتے تھے وہی یہ لوگ بسر کرتے تھے۔ یہ بھی انگریز کے اسی قانون کے پابند تھے جس کی پابندی دیگر مسلمان کرتے تھے۔ یہ بھی اسی سرزمین میں رہتے تھے جہاں "طاغوت" کا نظام رائج تھا اور انہی پابندیوں کے ساتھ جو اس نظام نے عائد کر رکھی تھیں۔ ان سے کہیں بہتر تو ہندوؤں کی وہ جماعتیں تھیں جنھوں نے انگریز کے کئی ایسے قوانین توڑ ڈالے جنھیں وہ نادرست خیال کرتی تھیں خواہ ایسا کرنے میں انھیں کتنی مصیبتیں کیوں نہ اٹھانی پڑیں! تو فرمائیے کہ وہ کونسی مابہ الامتیاز خصوصیت تھی جس کی بنا پر یہ اپنے آپ کو "سچے مسلمان" اور باقی مسلمانوں کو "پیدائشی مسلمان" کہتے تھے (اور اب بھی کہتے ہیں)۔ آپ کہدیں گے کہ یہ مسلمانوں کو "سچے مسلمان" بننے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا محض اس دعوت دینے سے یہ لوگ "سچے مسلمان" بن جاتے ہیں اور باقی مسلمان محض نام کے مسلمان رہ جاتے ہیں؟ پھر یہ بھی کہ کیا مسلمانوں کو سچے معنوں میں مسلمان بننے کی یہ آواز، سب سے پہلی آواز ہے؟ کیا مودودی صاحب سے پہلے کسی نے مسلمانوں کو یہ دعوت نہیں دی؟ اور جنھوں نے یہ دعوت دی ان میں سے کسی نے یہ بھی کیا کہ اپنی اس دعوت کی بنا پر اپنے آپ اور اپنے متبعین کو سچا مسلمان اور باقیوں کو نام کا مسلمان قرار دیدیا ہو؟ آپ غور کریں گے تو اس باب میں صرف قادیانیوں کی جماعت آپ کو ایسی ملے گی جنھوں نے ایسا کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ ان کی دعوت کو صحیح نہ سمجھیں (جیسا کہ اسلامی جماعت کی دعوت کو وہ درست نہیں سمجھتے)۔ لیکن اصل کے اعتبار سے دونوں میں یہ اشتراک ظاہر ہے۔

کی تائید پیش کی جائیں۔ یہ ایسی کھلی کھلی باتیں ہیں کہ یا دنے تامل سمجھ میں آسکتی ہیں یہ کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں ہے جو بغیر نصی تائیدات کے حل نہ ہو سکتا ہو۔ اس کے سمجھنے کی راہ میں جو چیز حائل ہو وہ صرف جذبات پرستی

اسلامی جماعت کا مدار اس پر ہے کہ وہ جذبات سے اپیل کرتی ہے حقائق سے نہیں۔ وہ کبھی نوجوانوں کو اس طرف نہیں آنے دیگی کہ جس قسم کے حالات سے ہم گذر رہے ہیں۔ ان میں ہمارے لئے راہِ صواب کونسی ہے۔ رہی نظری (Emotionalism) جوانسان کو ٹھوس حقائق (Concrete problems.) سے تصوراتی دنیا (Abstracts.) میں لئے لئے پھرتی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ جو عملی مشکلات ہمارے سامنے ہیں ان کا عملی حل کیا ہے۔ باقی سب شاعری ہے۔ اور چونکہ مسلمان نوجوان کو شاعری زیادہ مرغوب ہے اس لئے ہر وہ تحریک جو شاعری (جذبات) کو اپیل کریگی، ان کے نزدیک مقبول ہوگی۔ اسلامی جماعت قوم کے نوجوانوں کی اس نفسیاتی کمزوری سے کھیل رہی ہے۔

الفاظ میں، ہمارا مسلک یہ ہے کہ

(۱) پاکستان کی تحریک اسلام دوستی پر مبنی تھی (۲) اب پاکستان کا تحفظ اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش، عین اسلامی خدمت ہے۔	اس لئے کہ اس سے ہمیں ایک ایسی مملکت مل جاتی ہے جس میں اسلامی نظامِ زندگی کے قیام و ترویج کے مواقع حاصل ہو جاتے ہیں اور "ذریعہ" کا تحفظ "مقصد" کے تحفظ کا پہلا زینہ ہے۔
(۳) موجودہ مسلمان، جیسے بھی یہ ہیں، ان کی قوت اور بقا کے لئے ہر ممکن کوشش نہایت ضروری ہے اور اسلامی خدمت۔	اس لئے کہ ــــ غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے۔ انہی سے پاکستان کا تحفظ ممکن ہے اور پاکستان میں اسلامی نظامِ زندگی کے تجربہ گاہ بننے کے امکان ہیں۔
(۴) ہم سب مسلمان ایک ہی قسم کی اجتماعی بیماریوں میں مبتلا ہیں اس لئے اگر مسلمان ہیں تو ہم سب ہیں اور اگر مسلمان نہیں تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں۔ محض "صحیح اسلام" کی طرف دعوت دینے سے ہم میں سے کوئی شخص یا جماعت اپنے آپ کو باقی مسلمانوں سے الگ نہیں فرض کر سکتی۔ ایسا کرنا اسلام سے دشمنی ہے۔	اس لئے کہ محض دعوت دینے سے آپ الگ اجتماعی زندگی بسر نہیں کر سکتے جس کے لئے جداگانہ مملکت کا ہونا نہایت ضروری ہے اور مسلمانوں سے الگ ہو کر آپ ان کی جمعیت میں انتشار پیدا کرتے ہیں جو تحفظِ پاکستان کے لئے سخت ضرر رساں ہے
(۵) ہمیں بغیر جماعت سازی اور گروہ بندی کے، تحفظِ پاکستان کی کوششوں کے ساتھ ساتھ، قوم میں صحیح قرآنی نظام کا تصور جاگزیں اور اس کا احساس بیدار کرتے چلے جانا چاہیئے	اس لئے کہ تحزب و تشیع (جماعت سازی اور گروہ بندی) کو قرآن سنگین ترین جرم قرار دیتا ہے۔ جماعت اپنی گروہ سازیوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی ہے اور آج بھی ہو رہی ہے۔ جماعت سازی نفرت سکھاتی ہے اور قرآن رحماء بینھم کی تعلیم دیتا ہے

(۶) اور جب یہ احساس عام اور یہ تصور ہمہ گیر ہو جائے تو آئینی طور پر وہ تبدیلی پیدا کر دینی چاہیئے جس سے یہ تصور مملکت کا قانون بن جائے۔

اس لئے کہ زمانہ جمہور کی آواز سننے پر مجبور ہو رہا ہے اگر ہم نے جمہور میں ان خیالات کو عام کر دیا تو پھر کوئی طاقت ان خیالات کو دبا نہیں سکے گی۔ اس وقت تک ہمارے عوام (جمہور) میں یہ احساس بالکل ناپید ہے اس لئے اسلامی نظام کی آواز ایک "پارٹی" کی آواز ہے۔ عوام کی آواز نہیں۔ اسے عوام کی آواز بنانا نہایت ضروری ہے۔

(۷) بعض درد مند دلوں کی بیتابی تمنا انہیں تابِ انتظار نہیں دیتی اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ انقلاب شبا شب ہو جائے۔ یہ حضرات جذبات کی رو میں بہ جاتے ہیں۔ اور جذباتی تحریکیں انہیں بہت پسند آتی ہیں۔ لیکن تغیرِ حالات، صبر طلب ہوتا ہے اور وقت چاہتا ہے۔ دنیا کا کوئی انقلاب بھی راتوں رات رونما نہیں ہوا حتیٰ کہ اسلام کا انقلاب بھی نہیں۔ لہذا پاکستان میں مجوزہ انقلاب بھی وقت کا محتاج ہے۔

اس لئے کہ جو تبدیلی ہمارے ہاں ہوتی ہے وہ محض دستاویزی تبدیلی ہے، قلب و نظر کی تبدیلی نہیں۔ یہ تاریخ کے شاذ واقعات میں سے ہے کہ کسی قوم میں داخلی تبدیلی کے بغیر محض سیاسی طور پر خارجی تبدیلی واقعہ ہو گئی ہو۔ داخلی تبدیلی تدریجاً ہو گی۔ یہ مرحلہ صبر آزما ہے۔ استقلال و استقامت چاہتا ہے۔ لہذا صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ

بانشہ درویشی در ساز و دما دم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

---

(۴) مجلس آئین ساز

جناب محترم! السلام علیکم

آپ کی اور آپ کے توسط سے قارئینِ "طلوعِ اسلام" کی خدمت میں ایک استفسار پیش ہے۔ توقع ہے کہ اس کو اپنے مجلہ کے باب الاستفسار میں شائع فرما کر آپ خود یا اپنے ہم نظر و ہم فکر اصحاب میں سے کسی صاحب کے ذریعہ اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر عقدہ کشائی فرمائیں گے۔

یہ لازمی ہے کہ اس خطۂ زمین پر جسے ہم پاکستان کہتے ہیں اور جو ہمیں بطور ایک احسان کے عطا ہوا ہے آئندہ قرآنی نظامِ حکومت جاری و نافذ کیا جائے۔ اس وقت مجلس آئین ساز کے جو اراکین ہیں ان میں سے کتنے حضرات ایسے ہیں جو اس قسم کا آئین بنانا تو درکنار اس کا صحیح مفہوم بھی (خواہ اجمالاً ہی سہی) سمجھ بھی سکتے ہوں۔ دریں حالات ان بزرگوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ایسا آئین بنا سکیں گے محض خوش فہمی ہے۔ اس وقت جو توقع کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کیونکہ اس مجلس کے صدر محترم[۱] کی نظر تمام موجودہ اور مروجہ آئین ہائے ممالک پر حاوی ہے اس لئے وہ اور ان کے تمام دیگر رفقائے کار ان تمام مروجہ آئین کو سامنے رکھ کر اور "خذ ما صفا و دع ما کدر" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اس مخصوص قطعۂ زمین کے حسبِ حال ایک ایسا آئین بنانے میں کامیاب ہو سکیں گے جس میں تمام دیگر آئین ہائے

[۱] یہ خط مئی ۱۹۵۰ء میں لکھا گیا تھا۔ (طلوعِ اسلام)

ممالک کی وہ دفعات موجود ہوں جو ہمارے یہاں کے حالات پر منطبق ہو سکیں اور ان میں کچھ ایسی دفعات کا اضافہ کر دیا جائے گا جو یہاں کے لئے مخصوص طور پر وضع کی جاویں گی تاکہ یہاں کے مخصوص سیاسی، معاشی، تمدنی اور جغرافیائی حالات سے مطابقت کر سکیں۔ اگر اس وقت دنیا کے کسی ملک میں آئینِ شرعی جاری ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ بھی دیگر ممالک کے آئینوں کے ساتھ پیشِ نظر رکھ لیا جاتا بلکہ پھر تو شاید اس خاص ملک کے سوا اور کسی ملک کے آئین کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ لیکن دریں حالات جبکہ ایسا آئین اس وقت دنیا کے کسی ملک میں نافذ العمل نہیں ہے، صرف وہی آئین پیشِ نظر ہوں گے جو زیادہ تر خالص دنیاوی اور مادی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر وضع کئے گئے ہیں۔ اگر ہماری اس مجلس آئین ساز میں زیادہ تعداد ان حضرات کی ہوتی جو موجودہ سیاسی رجحانات اور تقاضوں کو سمجھنے کے ساتھ ہی ساتھ قرآنی فہم و بصیرت بھی رکھتے ہوتے تو پھر اس کی پرواہ نہ ہوتی کہ ان تمام آئینوں میں جو پیشِ نظر ہوں گے کوئی ایسا نہیں ہے جس میں قرآن کو مدِ نظر رکھا گیا ہو۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ نہ اس وقت ان بزرگوں کے سامنے کوئی ایسی مثال ہی موجود ہے اور نہ یہ خود ہی اس قابل ہیں۔ یعنی کہ "نقل" اور "عقل" دونوں جہتیں مفقود ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے اس صورت میں کیا کیا جائے۔ اس مشکل کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ موجودہ اراکین مجلس کو ہٹا کر دوسرے ایسے لوگ اس مجلس میں لائے جائیں جو قوم کے تقاضہ کو پورا کر سکیں۔ مگر یہ صورت موجودہ حالات میں بالکل ناممکن العمل ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ ہماری قوم میں ایسے لوگ نہیں ہیں جو مکمل قرآنی فہم اور پختہ دینی بصیرت کے ساتھ ساتھ ہی موجودہ بین الاقوامی تو کیا صرف قومی سیاست ہی سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ الا ماشاءاللہ۔ اور یہ نتیجہ ہے ہمارے گذشتہ اور موجودہ طریقۂ تعلیم کا جس میں تعلیم کا ایک جزو خالص "مولانا" اور دوسرا "مسٹر" بناتا رہا اور ہے۔ اور اس کی علت صرف یہ ہے کہ ہمارے سابقہ آقاؤں اور ان کے ہم رنگ و ہم سیاست حلیفوں نے اپنے سیاسی مفاد کے پیشِ نظر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اور خاص کر دنیا کے مسلمانوں میں "دین" اور "دنیا" کے باہم غیر متعلق بلکہ متضاد اور متصادم جہتیں ہونے کا پروپیگنڈا اس شدت اور عالمگیر پیمانہ پر کیا کہ نہ صرف ہمارے "مسٹر" بلکہ "مولانا" تک "دین" اور "دنیا" کو دو جداگانہ جہات یقین کرتے رہے۔ اور آج جبکہ ہمیں اپنے ملک کے لئے ایک ایسے آئین کے وضع کرنے کی ضرورت پڑی جو دینی اور دنیوی نقطہ ہائے خیال کا جامع ہو تو کوئی ایسی ہستی نظر نہیں آتی جو دونوں جہتوں میں ہماری رہنمائی کر سکے۔

دوسری وقت جو اس باب میں نظر آتی ہے وہ بھی بہت اہم ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر بفرضِ محال ہم انتہائی تجسس کے بعد ایسے افراد کو ڈھونڈھ نکالنے میں کامیاب بھی ہو جائیں جو ہمارے مفیدِ مطلب ہوں۔ تب بھی ان سے ہم کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مجلس آئین ساز کے موجودہ اراکین کی اکثریت صوبائی مجالس ہائے مقننہ سے منتخب ہو کر آئی ہے اور ان کی قابلیت و اہلیت کا ضامن وہ طریقۂ انتخاب ہے جس سے وہ ان صوبائی مجالس میں پہنچے ہیں اور جس میں اگر کوئی چیز پیشِ نظر رکھی جاتی ہے تو وہ دنیاوی وجاہت، ذاتی اثر و رسوخ اور پارٹی بازی ہے۔ اگر ان

صوبائی مجالس کے اراکین کے علاوہ بھی کچھ لوگ مجلس آئین ساز میں آئے ہیں تو ان کا انتخاب بھی مذکورہ بالا حقوق ہی کی بنا پر ہوا ہے۔ اگر امر محال کے طور پر یہ مان بھی لیا جائے کہ انتخابات میں بالکل غیر جانبداری اور باشعور سوجھ کو نظر انداز کر کے کام لیا گیا ہے اور صرف وہی لوگ مجلس آئین ساز میں بھیجے گئے ہیں جو ہر صوبہ کے بہترین دماغ سمجھے جاتے ہیں تب بھی ظاہر ہے کہ انتخاب کرنے والوں نے ان ہی لوگوں کو بھیجا ہے (اور آئندہ بھی انھیں کو بھیج سکتے ہیں) جو ان کے سیاسی اور مذہبی عقائد کے مطابق بہتر ہیں۔ اور خود انتخاب کنندہ جماعت میں ایک فرد بھی ایسا نہ نکلے گا جو صحیح معنوں میں مسلمان اور اس لحاظ سے دینی و دنیوی نہج فکر کی جامعیت رکھتا ہو پھر ایسے افراد کے انتخاب سے جو لوگ منتخب ہوں گے ان کی حالت ظاہر ہے کہ وہ کس حد تک ہمارے مقصد کو پورا کرنا تو درکنار سمجھ بھی سکتے ہیں۔ اب اگر مجلس آئین ساز سے ان لوگوں کو الگ بھی کر دیا جائے تو پھر بھی جو لوگ منتخب ہو کر آئیں گے وہ اسی حلقۂ انتخاب سے، اسی معیار قابلیت کی بنا پر اور ان ہی لوگوں کے منتخب کردہ آئیں گے جن میں صاحبان فکر و نظر کا فقدان ہے۔ صحیح حضرات اسی وقت مجلس آئین ساز میں آسکتے ہیں جبکہ اس دائرۂ انتخاب میں صحیح لوگ موجود ہوں اور انتخاب کرنے والے افراد خود صحیح ہوں اور صحیح طریقۂ انتخاب سے کام لیں۔ اور کیونکہ فی الحال اس دائرہ میں ایسے لوگ موجود نہیں ہیں (نہ انتخاب کرنے والوں میں اور نہ منتخب ہونے والوں میں) اس لئے ہم خواہ ہزار مرتبہ مجلس آئین ساز کے اراکین کو بدلیں مگر ہر بار اسی قسم کے لوگ آتے رہیں گے جیسے کہ اس وقت ہیں۔

بالفرض منتخب کنندہ جماعت میں ایسے لوگ ہوں جو صحیح پرکھ اور طریقۂ انتخاب سے کام لے سکتے ہیں لیکن اُن کے دائرہ انتخاب (صوبائی مجالس) میں ایسے حضرات مفقود ہیں جو اسلامی تفکر و تدبر سے کام لیکر آئین سازی کا کام سرانجام دے سکیں۔ اس لئے تاوقتیکہ نئے انتخابات کی رو سے نئے اور اہل حضرات اُن صوبائی مجالس میں نہ آئیں وہاں سے منتخب ہو کر مجلس آئین ساز میں کیسے آسکتے ہیں۔

اب مشکل یہ ہے کہ صوبائی مجالس کے انتخابات اس وقت تک نہیں ہو سکتے جب تک کہ نیا آئین مرتب نہ ہو جائے جس کے تحت نئے انتخاب ہو سکیں۔ لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ موجودہ قسم کے اراکین ہی کو آئین بنانا پڑے گا اور وہ ایسا ہی قرآنی اور اسلامی ہوگا جیسا مغرب زدہ دماغوں سے امید کی جا سکتی ہے۔

ان حالات میں یہ خواب دیکھنا کہ پاکستان میں کبھی بھی "اسلامی حکومت" ہوگی محض خوش فہمی سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ "خشت اول" رکھی جا رہی ہے اور یہ امید رکھنا کہ اس رواداری کی کمی کو آئندہ چل کر راست کر لیا جائے گا صرف فقدان دوراندیشی ہے۔ کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آئین ساز جماعت کی نااہلیت و ناقابلیت کی بنا پر اگر فی الحال اسلامی طرز حکومت نافذ نہ بھی ہو سکے تو آئندہ اس کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ ایک مرتبہ جب آئین بن گیا اور اس کے ماتحت غیر اسلامی دماغوں کے ذریعہ مختلف شعبہ جات حکومت میں کام شروع ہو گیا تو اس کے تحت شعبۂ تعلیم اس قابل ہو سکے گا جو صحیح اسلامی فکر و نظر اور قرآنی ذہنیت لوگوں میں پیدا کرے

ایسے افراد کو آئندہ مجالس ہائے مقننہ میں لاسکے جو اس آئین ہی میں آئندہ ترمیم و تنسیخ کرکے اسے مکمل قرآنی بنا سکیں؟

موجودہ صورت حالات خلاف توقع پیش نہیں آئی ہے۔ صاحبانِ نظر سے اس وقت بھی دیکھ رہے تھے جبکہ غیر منقسم ہند میں مسلم لیگ مطالبۂ پاکستان کی تائید لوگوں کو یہ کہکر کراتی تھی کہ پاکستان ایک خالص اسلامی حکومت ہوگی جس میں صرف قانون الٰہی نافذ ہوگا۔ عوام سے اس قسم کے وعدے کرنے والے خود بھی سمجھتے تھے کہ وہ اپنے وعدوں کا ایفا کس حد تک کرنا چاہتے ہیں اور کہاں تک کر سکیں گے اور سمجھنے والے اس وقت بھی سمجھ رہے تھے کہ یہ مطالبہ صرف ایک ایسے قطعۂ زمین کے لئے ہے جس میں مسلمان کہلانے والوں کی اکثریت ہو اور جس میں زیادہ سے زیادہ موجودہ "اسلامی ممالک" کا سا قانون نافذ کیا جائے۔

مندرجہ بالا تمام سطور کا لب لباب یہ ہے کہ:-

(۱) موجودہ مجلس مقننہ میں ایک فیصدی سے زیادہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو اسلامی آئین وضع کرنا چاہتے ہوں (اس کے اسباب مختلف ہیں کہ وہ ایسا کیوں نہیں چاہتے)

(۲) جو حضرات واقعی دل سے ایسے آئین کے خواہاں ہیں ان میں بمشکل ایک دو افراد ہی ایسے نکلیں گے جو اپنی خواہش کا صحیح مفہوم بھی سمجھتے ہوں۔

(۳) جو اراکین مجلس اس کا مفہوم سمجھتے بھی ہیں وہ دوسرے رفقائے کار کو اپنے نقطۂ نظر سے متفق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے (خواہ یہ اپنی قابلیت کی کمی کے یا اُن رفقائے کار کی ہٹ دھرمی یا اسلامی ذہنیت کو قبول کرنے کی عدم صلاحیت کی بنا پر) اور نہ خود اپنے خیالات کو مطالبہ (ریزولیوشن) کی شکل میں واضح اور جامع طور پر پیش کرنے کے قابل ہیں۔

(۴) موجودہ اراکین مجلس کو اگر بدلنے کی کوشش بھی کی جاوے تب بھی فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ منتخب کنندہ جماعت خود اسلامی فکر و نظر اور صحیح طریقۂ انتخاب کی اہلیت سے عاری ہے۔

(۵) اگر منتخب کنندہ جماعت درست طریقہ پر انتخاب بھی کر سکتی ہو تو اس کے حلقۂ انتخاب میں ایسے لوگ نہیں ہیں جو ہمارے مطالبہ کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

(۶) اور اس حلقۂ انتخاب کے افراد کو بدلا بھی نہیں جا سکتا تاوقتیکہ نیا آئین مرتب نہ ہو جائے جس کے ماتحت نئے انتخابات سے نئے حضرات اس حلقۂ انتخاب میں آسکیں۔

(۷) لہٰذا مجبوراً ہمیں انہی اراکین سے آئین سازی کا کام لینا پڑے گا اور ان ہی کے بنائے ہوئے آئین کو خواہ وہ کتنا ہی غیر اسلامی ہو قبول کرنا پڑے گا۔

(۸) اور یہ یقینی ہے کہ یہ حضرات اپنی غیر اسلامی ذہنیت اور تعلیم کی بنا پر جو آئین بنائیں گے وہ اسلامی ہرگز ہرگز نہیں ہوگا۔

کیا آپ یا آپ کے قارئین "طلوعِ اسلام" اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکیں گے کہ موجودہ صورت حالات

میں قرآنی ضابطے کے مطابق کسی آئین بننے کی توقع آپ کو کس بنا پر ہے اور مجلس آئین ساز میں وہ کون حضرات ہیں جن میں آپ اس کی اہلیت پاتے ہیں اور ان کی تعداد کتنے فی صدی ہے؟ اوروں کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جہاں تک میرا اور میرے ہم خیال لوگوں کا تعلق ہے ہم بالکل ناامید ہیں کہ یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔

نیاز کیش۔ ابوالعارف اعظم۔ کراچی ۵

طلوعِ اسلام اعظم صاحب کا یہ مکتوب گرامی ایک عرصہ سے ہمارے پاس آیا رکھا تھا لیکن ہم چاہتے تھے کہ اسے اس وقت شائع کریں جب مجلس آئین ساز کے اراکین کراچی میں موجود ہوں تاکہ یہ ان کی نگاہوں سے بھی گزر سکے۔

اعظم صاحب نے جس مشکل کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا ہمیں بھی احساس ہے لیکن اس کا حل، ہم طلوعِ اسلام میں پیش کر چکے ہیں۔ ہم نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہماری مجلس آئین ساز یا تو صرف اپنی آئینی ضروریات کو لکھ دے۔ یعنی یہ متعین کر دے کہ وہ کون کونسی شقیں ہیں جن میں انہیں قانون کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ملک میں قرآن جاننے والے ارباب فکر و نظر کی ایک مشاورتی مجلس مرتب کرلی جائے اور یہ آئینی ضروریات اس مجلس کے سپرد کر دی جائیں تاکہ وہ قرآن کی روشنی میں ان اقتضایات کو پورا کرنے والا ضابطۂ آئین مرتب کرے۔ پھر یہ ضابطہ مجلس آئین ساز کی تصویب کے بعد ملک کا قانون بن جائے۔

یا مجلس آئین ساز جس قسم کا قانون بنانا چاہتی ہے بنالے۔ اور اس مسودۂ قانون کو اس مشاورتی مجلس کے سپرد کر دے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ وہ مجلس اس ضابطہ کو قرآن کی روشنی میں پرکھ لے اور اس کی منشاء کے مطابق اس میں ضروری رد و بدل کر دے۔ اس ترمیم و تراش کے بعد مسودۂ قانون، مجلس دستور ساز کی منظوری حاصل کر لے اور یوں ملک کا قانون بن جائے ——— اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ وہ آئینی دشواری جس کی طرف اعظم صاحب نے اشارہ کیا ہے کوئی ایسی دشواری نہیں جس کا آئینی حل نہ مل سکتا ہو۔ اصل دشواری کچھ اور ہے جو جداگانہ ہے اور وہ ہے "نیت کی دشواری" جس کا حل کوئی نہیں۔ گھوڑے کو تالاب تک تو ایک بچہ بھی لے جا سکتا ہے لیکن پانی پینے پر ایک دستۂ فوج بھی مجبور نہیں کر سکتا۔ اسے پانی پینے پر صرف اندر کی پیاس آمادہ کر سکتی ہے۔ اگر پیاس ہوگی تو وہ رسّہ تڑا کر بھی پانی تک پہنچ جائے گا۔ یہاں بھی دشواری پانی تک پہنچنے کی نہیں، پیاس کی کمی (بلکہ فقدان) کی ہے۔ ہمیں تو کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے (خدا کرے ہمارا یہ احساس غلط ہو) کہ قرآنی دستور تو ایک طرف، ہمارے ارباب اختیار کا ارادہ سرے سے کسی قسم کا ضابطۂ آئین بنانے کا نہیں۔ جب موجودہ آئین میں (اگر اسے آئین کہا جا سکے تو) ان کی موجودہ پوزیشن کے تحفظ کا پورا پورا سامان موجود ہے۔ تو پھر انہیں کسی دوسرے ضابطۂ آئین کی ترتیب کی ضرورت کیا ہے؟ سو سب سے پہلے سوچنے کی یہ چیز ہے کہ انہیں آئین سازی پر آمادہ کیسے کیا جائے۔ یہ تو بعد کی بات ہے کہ وہ آئین کیسا ہو۔

بآدم نہ رسیدی خدا چہ می جوئی !

Regd. No. S. 1089

دورِ حاضرہ کی عظیم الشان کتاب

قرآن کے ابدی حقائق اور جناب پرویز کا حقیقت نگار قلم

معارف القرآن

جو اس اصول کے ماتحت مرتب کی گئی ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے

اور جس میں شرفِ انسانیت کیلئے واحد و مکمل ضابطۂ حیات ہے

قرآن کریم کی حیات بخش تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے کیلئے

اس قسم کی کوئی کتاب دنیا کی کسی زبان میں آپ کو نہیں ملے گی

جلد اوّل خدا، ایمان، [illegible] شرفِ انسانیت و امن و سلامتیٔ عالم کیلئے کیوں ضروری ہے۔ بڑی تقطیع۔ صفحات [illegible]۔ قیمت مجلد [illegible] روپے

جلد دوم نظریۂ ارتقاء، [illegible] آدم، ابلیس، ملائکہ و جنات کی حقیقت، وحی کی ضرورت، مقامِ رسالت۔ [illegible] صفحات۔ قیمت مجلد [illegible] روپے

جلد سوم انسانی انقلاب کی [illegible] حقیقت کشا تاریخ [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

ملنے کا پتہ: ناظم ادارہ اشاعت معارف القرآن [illegible] کراچی

Printed at Abbasi Litho Art Press, [illegible] Road, Karachi and published by [illegible] (Printer & Publisher) and issued from Tolu-e-Islam Office, Ramsingh Road, Karachi.